طلوعِ اسلام

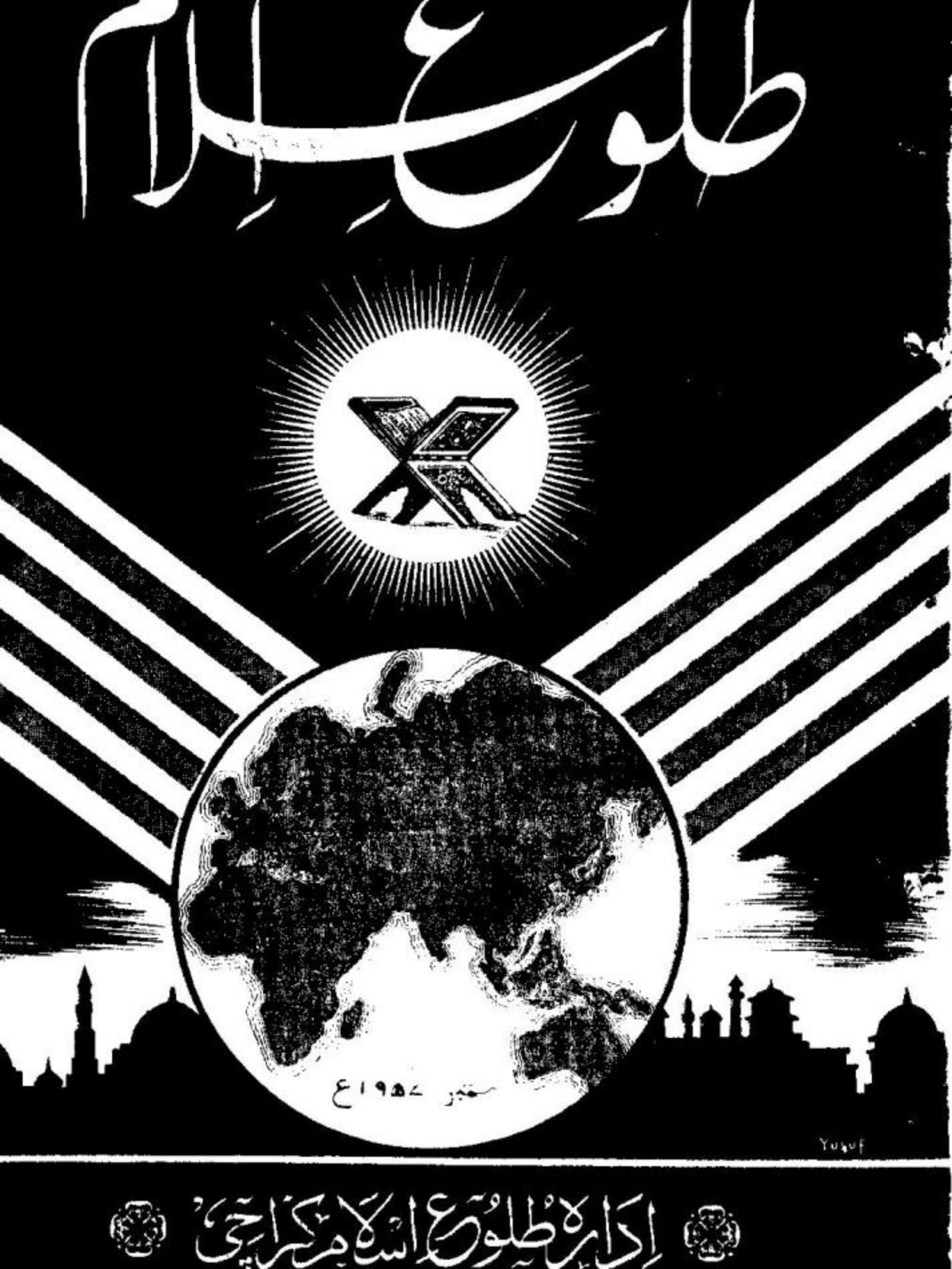

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام کراچی

ٹیلی فون:- ۴۱۴۸۸	قیمت فی پرچہ	بدل اشتراک
خط و کتابت کا پتہ:- ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام	ہندوستان اور پاکستان سے	ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ:- آٹھ روپے
۱۵۹- ۳/ایل (پی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی	بارہ آنے	غیر ممالک سے سالانہ:- ۱۴ شلنگ

جلد ۱۰ | ستمبر ۱۹۵۷ء | نمبر ۹

فہرست مضامین

لمعات	۲—۸	کشمیر اور ہندوستانی مسلمان	۵۳—۵۶
لائف کمیشن	۹—۱۳	(مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ علمائے ہند)	
(مدیر طلوعِ اسلام)		حقائق و عبر	۵۷—۶۰
شکریہ	۱۴—	قرآنی معاشرہ	۶۱—۶۷
(محترم پرویز صاحب)		(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)	
طلوعِ اسلام کنونشن	۱۵—۱۶	اسلام کی سرگذشت	۶۸—۷۲
قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی نہیں رہی	۱۷—۳۰	رابطۂ باہمی	۷۴—
(شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی مرحوم)		(سکریٹری مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام)	
مجلس اقبال	۳۳—۴۱	باب المراسلات	۷۶—۷۷
نقد و نظر	۴۲—۵۲	پیشگی خریداران	۷۹—

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جناب حسین شہید سہروردی - وزیر اعظم پاکستان کی خدمت میں

محترم المقام!

ہمیں اس کا احساس ہے کہ آپ مملکت سے متعلق نہایت اہم امور کی سر انجام دہی میں مصروف ہیں۔ اور بیحد مصروف۔ لیکن بایں ہمہ ہم آپ کی توجہ چند ایسے امور کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اشد ضروری۔ جن کے بگڑنے سے ہمارا سب کچھ بگڑ رہا ہے اور جن کے سنورنے سے ہمارا بہت کچھ سنور سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری ان گذارشات کو درخور اعتنا تصور کریں گے۔

"حکومت کا وجود کیوں ضروری ہے۔ اس کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ اور ایک اچھی حکومت کسے کہتے ہیں"۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کے متعلق افلاطون کے زمانہ سے لے کر آج تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو انبار کے انبار لگ جائیں۔ لیکن اس تمام ذخیرے کو اگر سمیٹا جائے تو اس میں سے قدرِ مشترک یہ نکلے گی کہ حکومت کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ افرادِ مملکت امن، آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کریں۔ امن ہر قسم کے خطرات سے۔ آرام جسمانی ضروریات کے بآسانی اور بافراط میسر آجانے سے۔ اور اطمینان، قلبی مسرتوں اور ذہنی خوشگواریوں کی رو سے۔ بنابریں ایک اچھی حکومت وہ ہوگی جس میں ہر فرد کی جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو۔ عصمت غرضیکہ زندگی کی ہر متاعِ عزیز محفوظ ہے۔ جس میں ان کی ضروریاتِ زندگی جگر پاش مشقتوں کے بغیر پوری ہوتی رہیں۔ انہیں اپنے معاملات کے سلجھانے اور سنوارنے میں کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ اور ان کے دل و دماغ کی صلاحیتیں بطریقِ احسن نشوونما پاتی رہیں۔ یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں ہو سکتا۔ اچھی اور بری۔ کامیاب اور ناکام۔ حکومت کے پرکھنے کی یہ ایسی کسوٹی ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

سوال یہ ہے کہ اگر حکومتِ پاکستان کو اس کسوٹی پر پرکھا جائے تو ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟ اگر اسے اس میزان میں تولا جائے تو اس کا کونسا پلڑا جھکتا ہے؟ اس مقصد کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی چند ایک مثالیں پیش کریں تاکہ

حقیقتِ حال بے نقاب ہو کر سامنے آجائے۔ تمہیداً اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ حقیقت سے پردہ اٹھانے کی یہ کوشش کسی تخریبی عنصر کی طرف سے نہیں ہو رہی۔ جس کا مقصد پاکستان کو بدنام فلہٰذا کمزور کرنا ہوتا ہے۔ یہ صدائے دردناک ہے اس طلوع اسلام کی طرف سے جس کے نزدیک مملکت پاکستان کا وجود اور اس کا استحکام جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ خطۂ زمین ہے جس میں طلوع اسلام کو توقع ہے کہ ہم اپنے تصورات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں گے۔ یعنی اس میں قرآنی نظام متشکل ہو سکیگا۔ اور قرآنی نظام کی تشکیل طلوع اسلام کے نزدیک ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ لہٰذا یہ تجزیۂ حالات درحقیقت ایک طبیب مشفق کی تشخیصِ مرض ہے۔ اور مقصد اس سے یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح مریض کا صحیح علاج ہو سکے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اسے اسی نگاہ سے دیکھیں گے اور اسی نقطۂ نظر سے اس پر توجہ دیں گے۔

سب سے پہلے حفاظت کو لیجئے۔ کہتے ہیں کہ ڈاکو راتوں کو آیا کرتے۔ اپنے چہرے نقاب میں چھپائے رکھتے۔ اور کسی دور افتادہ۔ تنہا آبادی پر چھاپہ مار کر فرار ہو جاتے۔

یہ بھی سنا ہے کہ رہزن ایسے راستوں میں چھپ کر بیٹھے رہتے جہاں لوگوں کی آمد و رفت کم ہوتی۔ اور جب دوپہر یا شام کے وقت کوئی اکیلا دکیلا مسافر اُدھر جا نکلتا تو اسے لوٹ کر بھاگ جاتے۔

ٹھگوں کے متعلق بھی سننے میں آیا ہے کہ وہ مہینوں کسی کے ساتھ رہتے۔ اس پر اپنا پورا پورا اعتماد قائم کرتے اور جب وہ اس طرح اپنی حفاظت سے بے خبر ہو جاتا تو پھر اسے دھوکا دیتے۔

لیکن ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ اس کے متعلق سارے ملک کو چھوڑیئے اور صرف کراچی کو لیجئے جو ہماری مملکت کا صدر مقام ہے اور جہاں آئین و ضوابط کا سب سے زیادہ احترام ہونا چاہیئے۔ کراچی کے متعلق ہم آئے دن (اخباروں میں) پڑھتے رہتے ہیں کہ عین صدر کے چوراہے میں جہاں ہزاروں آدمیوں کا جمگھٹا رہتا ہے دن کے وقت۔ ایک شخص کسی راستہ چلنے والے پر امن شہری کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اسے چاقو دکھاتا ہے۔ اور جو کچھ اسکے پاس ہوتا ہے چھین کر نہایت اطمینان سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

بندر روڈ پر ایک شخص چلا جا رہا ہے۔ دو آدمی اسے گھیر لیتے ہیں۔ وہ چیختا ہے۔ چلاتا ہے۔ دہائی دیتا ہے۔ راستہ چلتے لوگوں کو پکار پکار کر کہتا ہے کہ خدا کے لئے میری مدد کرو۔ یہ مجھے قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی دہشت سے کوئی شخص غریب کی مدد کے لئے آگے نہیں بڑھتا اور سینکڑوں آدمیوں کی موجودگی میں وہ اسے بکرے کی طرح ذبح کر ڈالتے ہیں۔

بس میں سامنے لکھا ہے کہ سگریٹ پینا منع ہے لیکن اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر کوئی بدقسمت کسی سگریٹ پینے والے کو ٹوکتا ہے تو وہ اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیتا ہے۔ بس میں شور اٹھتا ہے۔ بس رکتی ہے تو باقی سواریاں سراسیمہ ہو کر بھاگ اٹھتی ہیں کہ کہیں ان کا بھی ایسا ہی حشر نہ ہو جائے۔

ایک شریف زادی اڈے پر بس کے انتظار میں کھڑی ہے کہ اتنے میں دو چار غنڈے اسے گھیر لیتے ہیں اور بیسیوں آدمیوں کی موجودگی میں اسے ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر یہاں سے وہاں پہنچا دیتے ہیں۔ اور اب تو ان کی جراتوں کا یہ عالم ہو رہا ہے کہ ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں،

ایک نہیں، درجنوں شریف زادیوں کی عزت پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے۔

بچے سکول جاتے ہیں تو انھیں راستے ہی سے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ لڑکیاں کالج سے نکلتی ہیں تو ان کے راستے روک لئے جاتے ہیں کسی بدنصیب کو موٹر میں ڈال کر بھگا لیا جاتا ہے۔ کوئی معصوم کئی دنوں کے بعد کسی غلیظ جگہ سے برآمد کی جاتی ہے۔ کسی کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ وہ فلاں مقام پر فروخت کر دی گئی۔ سینکڑوں ایسی ہیں جنھیں عصمت فروشی پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور وہ ان انسان نما درندوں کی ہوسِ خون آشامی کا مستقل ذریعہ بنی رہتی اور جہنم کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ غرضیکہ کوئی صبح ایسی نہیں گذرتی کہ آپ اخبار اٹھائیں اور اس میں اس قسم کے قتل و غارت گری۔ قزاقی اور رہزنی۔ بردہ فروشی اور عصمت دری اور مختلف قسم کی بہیمیت اور درندگی کے واقعات درج نہ ملیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہر شریف آدمی اپنے اپنے ہاں ڈرا اور سہما ہوا زندگی کے دن بسر کر رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے ساتھ کل کیا ہونے والا ہے۔

محترم المقام!

غور فرمایئے کہ جہاں زندگی اس شکل سے گذر رہی ہو۔ وہاں لوگوں کی قلبی کیفیت کیا ہوگی؟ ہمیں معلوم ہے کہ ان میں سے ہر جرم کے لئے قانون موجود ہے۔ پولیس موجود ہے۔ عدالتیں موجود ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ روزمرہ کے واقعات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس مشینری میں کہیں کوئی سقم ہے ـــــ اور بہت بڑا سقم۔ اس کی وجہ سے بدمعاشوں کے دل سے قانون کا ڈر اور شریفوں کے دل سے اس کا اعتماد جاتا رہا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس سرزمین میں قانون کا ڈر اور اعتماد باقی نہ رہے وہ سرزمین بے آئین ہو جاتی ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ ذاتی طور پر دیکھیں کہ وہ سقم کہاں ہے اور اسے کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔

خفاظت سے نیچے اتر کر ضروریاتِ زندگی کی طرف آیئے تو وہاں حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ صحت اور زندگی کا مدار اشیائے خورد و نوش پر ہے۔ جس قسم کی یہ اشیا ملیں گی اسی قسم کی صحت ہوگی۔ اور جس قسم کی صحت ہوگی اسی نسبت سے قوم ترقی کرے گی۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ لوگوں کو ضروریات کے مطابق چیزیں ملتی ہی نہیں۔ مثلاً زندگی کا مدار پانی پر ہے اور کراچی میں پانی کی اس قدر قلت ہے کہ (بالخصوص گرمیوں میں) ہر طرف سے العطش۔ العطش کی آوازیں سننے میں آتی ہیں اور اس پر جس قدر لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

پانی سے آگے بڑھیئے تو روٹی کا سوال سامنے آتا ہے۔ سال میں کتنے دن ایسے آتے ہیں کہ لوگ پیسے ہاتھ میں لئے پھرتے ہیں اور آٹا کہیں سے نہیں ملتا۔ آٹا مل جائے تو دال اور سبزی نہیں ملتی۔ گوشت کے ناغے (اور ہڑتالیں) ہمارے ہاں کا معمول بن چکے ہیں۔ جو چیزیں ملتی ہیں ان کی قیمتیں دن بدن گراں ہوتی چلی جا رہی ہیں ـــــ اس قدر گراں کہ سفید پوش متوسط طبقہ پریشان ہے کہ اس طرح گذارہ کیسے چل سکے گا! بے شمار چیزیں تو ایسی ہیں جن کی قیمتیں مقرر نہیں۔ اس لئے جو کسی (دوکاندار) کے جی میں آئے وہ مانگ لیتا ہے اور آپ اس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہہ سکتے۔ جن چیزوں کی قیمتیں مقرر ہیں، وہ کبھی مقررہ قیمتوں پر نہیں ملتیں۔ اگر انہیں مقررہ قیمت پر فروخت کرنے پر اصرار کیجئے تو وہ چیزیں بازار سے گم ہو جاتی ہیں اور ضرورت مند بیچارہ مارا مارا پھرتا ہے۔ دوائیوں کے

معاملہ میں یہ اب بازار کا معمول بن چکا ہے۔

جو چیزیں ملتی ہیں ان کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کا نام کیا ہے اور وہ درحقیقت ہیں کیا؟ زندگی کی اساس ہوا پر ہے اور کراچی میں کوئی سانس ایسا نہیں لیا جا سکتا جس میں بیماریوں کے جراثیم اور گرد و غبار نہ ملا ہوا ہو۔ ہوا سے آگے بڑھ کر پانی کی طرف آیئے تو وہاں صورتِ حال اس سے بھی بدتر ہے۔ دو سال اُدھر یہ خبریں ملی تھیں کہ کراچی کی واٹر سپلائی میں پانی اور غلاظت اس طرح "شیر و شکر" ہو رہے ہیں کہ انہیں الگ الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ چار دن یہ شور رہا۔ اس کے بعد پھر معلوم ہی نہیں کہ کیا ہوا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جسے دیکھئے پیٹ کو پکڑے پکڑے پھر رہا ہے اور ڈاکٹر سے سن رہا ہے کہ یہ سب کراچی کے پانی کی وجہ سے ہے۔

پانی سے آگے آٹے کی باری آتی ہے۔ سو اس کے متعلق کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ ہم کیا کھا رہے ہیں۔ جب آٹے کی یہ حالت ہے تو دودھ اور گھی خالص کہاں سے ملے گا؟ بچے دودھ کے نام سے یوں گھبراتے ہیں جیسے انہیں کونین مکسچر پلایا جا رہا ہو۔ اس لئے کہ نہ صرف یہ کہ اُس آبِ سفید کا (جسے دودھ کہا جاتا ہے) ذائقہ خراب ہوتا ہے۔ اس میں سے اس قسم کی بو آتی ہے جسے بچوں کی طبعِ لطیف گوارا ہی نہیں کر سکتی۔ باقی رہا گھی۔ سو اس کے متعلق جتنا کم کہا جائے اچھا ہے۔ بوٹ پالش اور ویزلین کی طنزیں اب پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہیں اور جدید طنزیں لوگوں نے اس لئے وضع کرنی چھوڑ دی ہیں کہ انہوں نے ذاتی تجربہ سے دیکھ لیا ہے کہ کہنے والے نے کس قدر سچ کہا تھا کہ

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
تیرے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

یہ ہے جنابِ محترم! وہ غذا جو لوگوں کو نصیب ہو رہی ہے۔ ہم میں سے جانے والی نسل کو تو چھوڑیئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن پورے کر کے مر جائیں گے۔ سوال آنے والی نسل کا ہے جس نے کل کو ملتِ پاکستانیہ بننا ہے۔ اگر آپ اس کا اندازہ کرنا چاہیں کہ اس غذا کا ہمارے بچوں پر کیا اثر پڑ رہا ہے تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی اسکول کے دروازے کے سامنے اس وقت کھڑے ہو جایئے جب بچوں کو چھٹی مل رہی ہو۔ (آپ کسی چھوٹے موٹے اسکول میں نہ جایئے بلکہ (مثلاً) گرامر اسکول میں چلے جایئے جہاں کراچی کے اعلیٰ ترین طبقہ کے بچے تعلیم پاتے ہیں) آپ دیکھئے کہ کسی بچے کے چہرے پر تازگی اور کسی کے جسم میں خونِ صالح کا قطرہ دکھائی دیتا ہے؟ منحنی۔ زرد رو۔ کمزور بچے جو زندگی کی شگفتگی اور شادابی سے یکسر محروم ہیں۔ یہ ہیں ہماری آنے والی قوم کے بہترین نمونے انہی سے ہمارے جیوش دعسا کر مرتب ہونے ہیں اور انہی سے سول کی انتظامیہ تشکل۔ آپ سوچئے کہ جو جسم اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں وہ قوم کی ذمہ داریوں کو کیسے اٹھا سکیں گے؟ یہ مسئلہ بڑی گہری توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے کہ جو قوم اپنے مستقبل پر نگاہ نہیں رکھتی، صفحۂ کائنات پر اسے ثبات و دوام نصیب نہیں ہو سکتا۔

ہمیں اس کا علم ہے کہ ان تمام امور کی دیکھ بھال کے لئے محکمے اور شعبے متعین ہیں اور ان محکموں کے پیچھے قانون کی قوت بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو کچھ ہو رہا ہے اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ تمام انتظامات اپنا صحیح نتیجہ کیوں نہیں

مرتب کر رہے ؟ اور یہی وہ سوال ہے جس کے حل کے لئے ہم نے آپ کو ذاتی طور پر مخاطب کرنے کی جسارت کی ہے۔

جسم کی ضروریات کے بعد قوم کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کی نشوونما کا سوال آتا ہے۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما تعلیم اور تربیت سے ہوتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، قوم کے پچاس فیصد سے بھی زائد بچے ایسے ہوں گے جنھیں کسی اسکول (یا کالج) میں داخلہ ہی نہیں ملتا۔ جنھیں داخلہ ملتا ہے ان پر خرچ اتنا اٹھتا ہے کہ متوسط طبقہ کے لوگ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ نرسری کلاس میں (جہاں بچے محض کھیلنے کے لئے جاتے ہیں) ایک بچے کی فیس بیس روپے ماہوار کے قریب ہوتی ہے۔ کتابوں، کاپیوں، متفرق اشیاء یونیفارم وغیرہ کا خرچ مستزاد ہے۔ جب بچہ نرسری کلاس سے ذرا آگے بڑھے تو اسکول کی طرف سے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں کہ بچے کے لئے پرائیویٹ ٹیوشن کا انتظام کیا جائے۔ یہ ٹیوشن کسی صورت میں بھی چالیس پچاس روپے ماہوار سے کم نہیں ہوتی۔ یہ ابتدائی کلاسز کا حال ہے۔ اس سے اوپر چل کر خرچ کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔

اتنے اخراجات کے بعد بچوں کو جس سطح کی تعلیم ملتی ہے، ان کے امتحانات کے نتائج اس کے آئینہ دار ہیں۔ کامیابی کی شرح ہر سال نیچے گرتی جا رہی ہے۔ جو طالب علم کامیاب ہو کر نکلتے ہیں، ان کی قابلیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔

یہ تو رہا تعلیم کا معیار۔ جہاں تک اس کے نہج و اسلوب کا تعلق ہے، ہم اُس دور میں پھر رہے ہیں جو انگریزوں کی غلامی کا تھا۔ نہ تعلیم کی بنیادی پالیسی میں کوئی فرق آیا ہے۔ نہ نصاب میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی۔ اگر کہیں کوئی تبدیلی ہوئی ہے تو اس کے نتائج پہلے سے بھی بدتر ہیں۔ تعلیم میں نہ اسلامی اقدار کا کوئی لحاظ رکھا جا رہا ہے نہ پاکستان کی آئیڈیلوجی کی کوئی رعایت۔ نہ مسلمانوں کے مخصوص تصورات حیات کا کوئی خیال ہے۔ نہ ان کے نظریاتِ زندگی کا کوئی تصور۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے نوجوان طبقہ کے ذہنوں میں انتشار، خیالات میں پراگندگی، افکار میں بے راہ روی، نگاہوں میں بے باکی اور قلوب میں سرکشی کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ قوم کی درسگاہیں، قوم کے بچوں کے صحیح تربیتی مراکز ہوتی ہیں۔ جن درسگاہوں کا یہ عالم ہو ان میں بچوں کی جس قسم کی تربیت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ ان کی تباہی و بربادی کے لئے یہی فتنہ کچھ کم نہ تھا کہ اس پر مغرب سے آنے والے فحش اور عریاں لٹریچر کے سیلاب کے سب بند کھول دیئے گئے ہیں۔ یہ ہے وہ قعرِ دریا جس میں ہم نے اپنے نوجوانوں کو تختہ بند کر رکھا ہے اور اس کے بعد ان سے کہا جاتا ہے کہ دامن تر مکن ہوشیار باش!

جس قوم کے نوجوانوں کی تعلیم اور تربیت کا یہ عالم ہو، اس کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنے کے لئے "الہام" کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ یہ چیز ہر نوجوان کی پیشانی پر لکھی مل جائے گی۔ بس اس کے پڑھنے کے لئے بصارت کے بجائے بصیرت کی ضرورت ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ تعلیم کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کافی روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کی انتظامی مشینری ہر وقت متحرک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود، جو نتائج ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔

یہ ہے، ہمارے محترم! افرادِ مملکتِ پاکستان کے امن۔ چین اور اطمینان کی حالت۔ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس میں نہ کوئی نئی بات ہے نہ غیر معمولی واقعہ۔ یہ وہ واقعات ہیں جو ہر روز ہماری آنکھوں کے سامنے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس صورتِ حالات کو اطمینان بخش کہا جاسکتا ہے؟ اور اگر اسے اطمینان بخش نہیں کہا جاسکتا تو کیا ان واقعات کی اہمیت اور نزاکت اس کی متقاضی نہیں کہ ان کی طرف فوراً توجہ مبذول کی جائے؟ ہمارا خیال ہے کہ حالات کی نزاکت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آپ کی ذاتی اور خصوصی توجہ کے بغیر ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ بیحد مصروف ہیں۔ اور اس کا بھی ہمیں احساس ہے کہ جن امور میں آپ مصروف ہیں وہ بڑے اہم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، ہمارا خیال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ جن حالات کی طرف ہم نے توجہ مبذول کرائی ہے وہ ان سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ اگر ان کی طرف فوری توجہ نہ دی گئی تو ہمیں ڈر ہے کہ کہیں اب از سرگزشت کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے اور اس کے بعد جن اہم امور کی سرانجام دہی میں آپ اس وقت مصروف ہیں، ان میں آپ کی کامیابی، (خدا نکردہ) امریکہ کے اس مشہور سرجن کی کامیابی کی مثال نہ بن جائے جس نے ایک بڑے معرکے کے اپریشن کے بعد دنیائے طب میں یہ خبر نشر کی تھی کہ اپریشن بڑا کامیاب رہا۔ صرف اتنا ہوا کہ مریض نہ بچ سکا۔

کیا ہم توقع کریں کہ آپ ان گذارشات کو مستحقِ توجہ خیال فرمائیں گے؟ ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ نے ان کی طرف کماحقہٗ توجہ دی تو حالات بہت جلد سدھر جائیں گے۔ اس لئے کہ فطرت کی طرف سے آپ کو جس قدر کام کرنے کی صلاحیت اور توانائی عطا ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر یہ مرحلہ آپ کے لئے کچھ ایسا دشوار گذار نہیں۔ ضرورت ہے دیانتِ مقصد کے ساتھ اس مسئلہ کو ہاتھ میں لینے کی۔ اس کے لئے ضرورت ہے عزمِ راسخ اور ہمتِ بلند کی۔ ضرورت ہے جرأت اور بیباکی کی۔ ضرورت ہے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ترازوئے عدل کو ہاتھ میں لینے کی۔ اور ضرورت ہے چھوٹے اور بڑے۔ اور غریب اور امیر کا امتیاز کئے بغیر بطشِ شدید اور گرفتِ محکم کی۔ اس سے ایسی فضا پیدا ہو سکتی ہے جس میں قانون شکنی کا ارادہ کرنے والے کا تنہائی میں بھی خوف سے دل کانپ اٹھے اور پر امن شریف انسان اطمینان کی نیند سو سکیں۔ جو حکومت ایسی فضا پیدا کردے وہی کامیاب اور قابلِ فخر حکومت کہلا سکتی ہے۔ اگر آپ نے ایسی فضا پیدا کردی تو یقین مانئے کہ کروڑوں دلوں کا اطمینان، جریدۂ عالم پر آپ کا دوام ثبت کردے گا۔

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دل گدازے

---x---

(۲)

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ جس سے ہمیں دوچار ہونا پڑا، مسئلہ کشمیر تھا۔ یہ مسئلہ دن بدن پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا اور

اب وہ اس نازک مرحلہ میں آپہنچا ہے جس کے بعد اسے سلجھانے کے لئے ہمیں سردھڑ کی بازی لگا دینی پڑے گی۔ ہندوستان نے جو روّیہ اختیار کر رکھا ہے اس کے پیشِ نظر صاف دکھائی دیتا ہے کہ اب کشمکش سخت اور تیز ہو جائے گی۔

دوسرا مسئلہ جو ہمارے لئے وجہ سوہانِ روح بن گیا وہ نہروں کے پانی کا مسئلہ ہے۔ اس میں بھی فریقِ مخالف بھارت ہے جو اپنے نشۂ قوت میں سرمست کسی معقول اور مناسب بات کے سننے کے لئے تیار نہیں۔

کشمیر اور پانی کا سوال پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ملک اس قسم کی نازک کشمکش میں مبتلا ہو اس کے اربابِ حل و عقد اور اصحابِ دانش و بینش پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو جانا چاہیئے۔ اور انھیں تمام جزئی امور کو ایک طرف رکھ کر کامل یک جہتی اور یک نگہی سے اس مشکل کے حل کی جستجو میں اپنا لہو پسینہ ایک کر دینا چاہیئے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کے برعکس جو کچھ ہو رہا ہے اس کی زندہ شہادت ہماری بساطِ سیاست اور اس کی مہرہ بازیاں ہیں۔ اس بساط پر جو کچھ گزشتہ دو تین برس سے ہو رہا ہے (اور جس کی رفتار گزشتہ ایک سال سے اور بھی تیز ہو رہی ہے) اس سے صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے زعمائے کرام اور لیڈرانِ عظام کو نہ کشمیر کی فکر ہے نہ نہروں کے پانی سے کچھ دلچسپی۔ انھیں دلچسپی ہے تو فقط اپنی ذات سے۔ ان کے پیشِ نظر ہیں تو صرف اپنے مفاد اور ہوسِ اقتدار کی تسکین۔ وہ سب ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی کا راز سمجھتے ہیں۔

اس کی وجہ؟ بالکل واضح اور بین۔ یعنی سیرت کی کمزوری۔ کیریکٹر کا فقدان۔ اور اس کا علاج؟ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم میں سے ہر ایک خاموش ہو جاتا ہے اور کسی کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس لئے کہ دنیا میں ابھی کوئی ایسا انجکشن ایجاد نہیں ہوا جس سے کسی کے دل میں کیریکٹر داخل کر دیا جائے۔ کیریکٹر پیدا ہوتا ہے صحیح تعلیم اور مناسب تربیت سے۔ اور تعلیم و تربیت کا انتظام آپ آنے والی نسل کے لئے تو کر سکتے ہیں۔ طفلانِ کہن سال کے لئے نہیں کر سکتے۔ ان کا علاج صرف قانون کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس کی طرف ہم نے ایک سابقہ اشاعت میں توجہ دلائی تھی۔ یعنی اس کشمکش کے ختم کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے آئین میں اس قسم کی تبدیلی کرلیں جس سے وزیرِ اعظم (اور صوبے کے چیف منسٹروں) کا انتخاب براہِ راست ہو۔ اور جو امیدوار منتخب ہوں وہ صدرِ مملکت کی طرح آئندہ انتخاب تک اپنی اپنی کرسی پر متمکن رہیں۔ انھیں وہاں سے ہٹانا ہو تو اس کے لئے وہی طریق اختیار کیا جائے جو صدرِ مملکت کے لئے آئین میں رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی تجویز کرنا چاہتے ہیں کہ الیکشن میں جو ممبر کسی پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے اگر وہ اپنی پارٹی کو چھوڑ دے تو اسے رکنیت سے الگ کر دیا جائے اور اس کی سیٹ کا پھر نیا الیکشن ہو جس میں وہ چاہے تو نئی پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے۔ واضح رہے کہ ہم ان تبدیلیوں کی تجویز ملک کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر کر رہے ہیں۔ ورنہ ہمارے نزدیک تو پارٹیوں کا وجود ہی ہلاکت انگیز ہے۔

لاء کمیشن

پاکستان لاء کمیشن کی اہمیت اور اسکی گراں بار ذمہ داریوں کے متعلق ہم عمومی طور پر مارچ اور اپریل ۱۹۵۷ء کی اشاعتوں میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ اب حکومت کی طرف سے اراکین کمیشن کے تقرر کا بھی اعلان ہو گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کمیشن کو ہر لحاظ سے بہترین اور موزوں ترین تو نہیں کہا جا سکتا لیکن بہ حالاتِ موجودہ اتنا بھی غنیمت ہے۔ اس میں قدیم اور جدید تصورات کے حاملین کا امتزاج ایک گونہ اطمینان بخش ہے۔ اور اگر ان حضرات نے باہمی تعاون سے کام لیا تو اس سے خوشگوار نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں لاء کمیشن کا تقرر نہ صرف پاکستان بلکہ ملت اسلامیہ کی پوری زندگی میں ایک تاریخی اقدام ہے۔ ہمارے ہاں اس وقت تک اسلامی قوانین ایک مرتب ضابطہ کی شکل میں کہیں موجود نہیں۔ لاء کمیشن کے فرائض میں اتنا ہی نہیں کہ وہ ان قوانین کو ایک ضابطہ کی شکل میں مرتب کرے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ انہیں "کتاب و سنت" کے مطابق متشکل کرنے کی سفارش کرے۔ اگر اس کمیشن نے اس اہم فریضہ کو قرآنِ عظیم کی منشاء کے مطابق سرانجام دے دیا تو آپ دیکھیں گے کہ پاکستان کو نہ صرف دیگر اسلامی ممالک میں ایک خاص مقام حاصل ہو جاتا ہے بلکہ غیر مسلم اقوام بھی دیکھ لیں گی کہ قرآن کریم نوعِ انسانی کے اہم مسائل کا حل کس حسن و خوبی سے پیش کرتا ہے۔

پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا مرہونِ منت ہے۔ ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں اسلامی آئیڈیالوجی ایک جیتے جاگتے قرآنی معاشرہ کی شکل میں سامنے آجائے۔ یہ ملت کی محرومی تھی کہ علامہ مرحوم حصولِ پاکستان سے پہلے ہی ہم سے جدا ہو گئے۔ لیکن ہماری خوش قسمتی ہے یہ کمی محترم پرویز صاحب کی ذات سے پوری ہو گئی۔ انہوں نے نہ صرف اقبال کی فکر کو زندہ رکھا اور آگے بڑھایا ہے بلکہ اپنی پیہم کوششوں سے قرآنی تصوراتِ زندگی کے عام کرنے میں جو خدمات سرانجام دی ہیں، اس کی مثال بمشکل مل سکیگی۔

قبل اس کے کہ اس ضمن میں ہم کچھ اور لکھیں ہم قارئین طلوع اسلام کے سامنے اپنی ایک مجبوری کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ہم نے جب بھی محترم پرویز صاحب کی ذات کے متعلق اپنے قلبی احساسات کو طلوع اسلام میں پیش کرنا چاہا ان کی انکسار پسند طبیعت نے ہمیشہ ہمارا ہاتھ روک لیا۔ لیکن اس موقعہ پر ہم صاحب موصوف سے انتہائی معذرت کے ساتھ تھوڑی سی جرأت سے کام لینا چاہتے ہیں اور ملت پاکستانیہ کو بتانا چاہتے ہیں کہ آج فضا میں اسلامی آئیڈیالوجی اور قرآنی نظامِ معاشرہ کی جو آواز بلند ہو رہی ہے، اس میں اس صاحب

فکر وبصیرت کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ واضح رہے کہ پرویز صاحب کی قرآنی تعلیم نے ہمیں شخصیت پرستی سے بہت بلند کر دیا ہے اس لئے جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں وہ شخصیت پرستی نہیں بلکہ اظہار حقیقت ہے۔ اس کا تعلق پرویز صاحب کی ذات اور شخصیت سے نہیں بلکہ ان کے مشن اور کام سے ہے اور یہ کچھ لکھنا اس وجہ سے چاہتے ہیں کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اگر لاء کمیشن نے ان کی قرآنی بصیرت سے کما حقہ استفادہ کیا تو اس سے پورے عالم اسلامی کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔

پرویز صاحب کی لاء کمیشن میں شمولیت کوئی ہنگامی واقعہ نہیں۔ یہ ان کے عمر بھر کے مشن کے سلسلۂ دراز کی ایک کڑی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کا منطقی اور لازمی نتیجہ۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کیا تو (باستثنائے چند) مختلف طبقات نے اسے ایک شاعر کا خواب اور فلسفی کا ناممکن العمل تصور قرار دیا۔ لیکن دہلی اور شملہ کے احباب اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ عین اس زمانے میں پرویز صاحب کا اس تصور پر کس قدر محکم یقین تھا اور وہ کس طرح اسے قرآن کی روشنی میں، حقیقتِ ثابتہ اور دین کے نظام کے لئے لاینفک شرط قرار دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب سنہ ۳۸-۱۹۳۷ء میں قائد اعظم مرحوم نے اس تصور کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے تحریک پاکستان شروع کی تو پرویز صاحب زندگی کے پورے ساز و براق کے ساتھ اس میدان میں اتر آئے۔ اس وقت تحریک پاکستان کو سب سے بڑا خطرہ نیشنلسٹ علماء کی طرف سے تھا۔ پرویز صاحب نے اس محاذ کو سنبھالا اور جس ہمت و پامردی سے اس سیلاب بلا کو روکا 'طلوع اسلام' کی مجلدات اس کی زندہ شہادت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ طلوع اسلام ہی وہ ذریعہ تھا جس سے غیر تو ایک طرف، خود مسلمانوں پر بھی یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ پاکستان کا مطالبہ ایک سیاسی حربہ نہیں بلکہ مسلمانوں کا بحیثیت مسلمان ہونے کے ایک دینی تقاضا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پرویز صاحب کی جرأت اور حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ وہ دن بھر گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں (یعنی انگریز اور ہندو دونوں کے زیر اقتدار ہوم ڈیپارٹمنٹ میں) اپنی ملازمت کے فرائض سرانجام دیتے تھے اور شام کو جناح صاحب کی کوٹھی پر ہوتے تھے اور یہ کوئی ایک آدھ دن کی بات نہیں تھی۔ متواتر آٹھ نو برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سکریٹریٹ کی چار دیواری میں جناح صاحب کا نام لینا بھی جرم تصور کیا جاتا تھا اور یہ معلوم کر کے آپ حیران ہوں گے کہ یہ سب کچھ پرویز صاحب تن تنہا کرتے تھے۔ اس میں کسی کی رفاقت شامل تھی نہ اعانت۔ اعانت کا اندازہ تو اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ خود محترم قائد اعظم نے ان سے کئی بار کہا کہ چونکہ طلوع اسلام تحریک پاکستان ہی کی ایک آواز ہے اور اس آواز کی نشر و اشاعت کے لئے ہمارے پاس فنڈ موجود ہے تو اس میں سے طلوع اسلام کو مدد لینے میں کیا باک ہو سکتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے ہمیشہ اظہار معذرت کیا۔ اور آخری مرتبہ جب قائد اعظم نے بااصرار پوچھا کہ ان کے انکار کی کیا وجہ ہے تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے کہ طلوع اسلام کو کل آپ ہی کے خلاف کچھ لکھنا پڑے۔ تو اگرچہ آپ اسے شاید برا نہ منائیں لیکن ہو سکتا ہے کہ مالی امداد کا خیال اس کا ہاتھ روک لے یا اس میں رعشہ پیدا کر دے۔ تشکیل پاکستان پر محترم قائد اعظم کی چشم نظر پرویز صاحب کے لئے اچھے اچھے مناصب تھے لیکن انہوں نے اس سے بھی یہ کہہ کر اظہار معذرت کر دیا کہ [illegible] شعوری [illegible] مناصب سے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ میری خدمات کا معاوضہ بن جائے گا لیکن میں نے جو کچھ کیا ہے، خالصتاً قرآنی فریضہ سمجھ کر کیا ہے۔ [illegible] حیثیت میں ہندوستان میں تھے بعینہٖ اسی حیثیت میں پاکستان سکریٹریٹ میں آ گئے۔ اس کے بعد [illegible]

انھوں نے اپنی ملازمت کے سلسلہ میں حکومت سے کوئی خصوصی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنے مشن کے لئے بھی ان سے کوئی رعایت حاصل نہیں کی (رعایت حاصل کرنا تو ایک طرف بعض معاملات میں حکومت کی طرف سے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اس کی یاد بڑی تلخ ہے)

پاکستان بن جانے کے بعد پرویز صاحب نے اپنی مساعی کا سلسلہ پہلے سے بھی زیادہ جذب و انہماک اور قوت اور تیز رفتاری سے جاری رکھا۔ یہاں سب سے اہم سوال تدوین دستور اور ترتیب قوانین کا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے مقابل کئی ایک فریق تھے۔ سب سے پہلے ارباب اقتدار کا مغرب زدہ طبقہ جو یہاں سیکولر انداز کی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہوں جو دینی قیود سے بچنے کی خاطر ایسا چاہتے ہوں لیکن زیادہ تر اس کی وجہ ملا کی طرف سے پیش کردہ اسلام کا نقشہ تھا جس کے مطابق وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان اقوام عالم کے ساتھ دو قدم تک بھی نہیں چل سکیگا۔ پرویز صاحب نے جس ہمت اور استقلال سے اس محاذ کا مقابلہ کیا' طلوع اسلام کے صفحات اس پر شاہد ہیں (واضح رہے کہ اس زمانے میں بھی ملازمت ہی میں تھے) دوسرا فریق مخالف کمیونسٹ گروہ تھا جو غریبوں اور مظلوموں کی ہمدردی کے نقاب میں ایک ایسا نظام قائم کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے جس میں نہ خدا باقی رہتا ہے نہ اس کا رسول۔ نہ قانون مکافات عمل کا تصور موجود ہوتا ہے نہ حیات آخرت پر ایمان۔ پرویز صاحب نے اس گروہ کی مخالفت کا مقابلہ اپنے مثبت پروگرام سے کیا۔ انھوں نے قرآن کا معاشی انداز اس حسن و خوبی اور مدلل طریق سے پیش کیا کہ اس کے سامنے کمیونزم کا نظام پھیکا پڑ گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ملک میں نوجوان تعلیم یافتہ گروہ کا اچھا خاصہ طبقہ ہے جو نہ صرف کمیونزم کے سیلاب بلا میں بہہ جانے سے بچ گیا بلکہ وہ اس کے راستے میں بند کا کام دے رہا ہے۔

تیسرا فریق ان کے سامنے قدامت پرست ملایانہ مذہب کا تھا۔ ہمیں انتہائی تاسف اور ندامت سے کہنا پڑتا ہے کہ اس گروہ نے اپنی مخالفت میں ایسے پست حربوں سے کام لیا جس کا تصور ہر قلب سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ انھوں نے ان کے خلاف ہر قسم کے اتہامات تراشے اور ہر طرح کی غلط بیانیوں سے کام لیا۔ کہیں کہہ دیا کہ یہ تین نمازوں کے قائل ہیں۔ اور وہ بھی کچھ عجیب انداز کی۔ کبھی یہ مشہور کر دیا کہ یہ صرف تین روزے فرض سمجھتے ہیں۔ کہیں انھیں (معاذ اللہ) منکر شان رسالت قرار دے کر مطعون کر دیا اور کہیں ان کا رشتہ بچی کھچی فرقہ اہل قرآن کے ساتھ جوڑ دیا۔ ان کے متعلق مشہور کر دیا کہ یہ منکر حدیث ہیں۔ حالانکہ آج تک کسی نے متعین طور پر بتایا ہی نہیں کہ منکر حدیث کہتے کسے ہیں اور پرویز صاحب کس طرح منکر حدیث ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جمعیت اہلحدیث (گوجرانوالہ) کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے "جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث" (اس کتاب پر جولائی کے طلوع اسلام میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے) اس میں انھوں نے ایک فہرست ان افراد اور جماعتوں کی دی ہے جو ان کے نزدیک منکرین حدیث ہیں۔ اس فہرست میں "مولانا شبلی۔ مولانا حمید الدین فراہی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مولانا امین احسن اصلاحی۔ اور عام فرزندان ندوہ بالخصوص سید سلیمان ندوی" کو بھی ان ہی الفاظ میں اس زمرہ میں شامل کیا ہے۔ اگر انکار حدیث اس کا نام ہے کہ جو اقوال رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہیں ان میں سے کسی کی صحت سے انکار کیا جائے تو سب سے بڑے منکر حدیث خود امام بخاری ہوں گے جنھوں نے خود اپنے بیان کے مطابق چھ لاکھ احادیث میں سے پانچ لاکھ چورانوے ہزار سے انکار کر دیا اور صرف چھ ہزار کو قبول کیا۔ امام بخاری کے سامنے تو معلوم نہیں معیار کیا تھا لیکن پرویز صاحب کا کہنا یہ ہے کہ جو روایت قرآن کے خلاف جاتی ہو وہ کبھی رسول اللہ کی نہیں

ہو سکتی۔ احادیث کو پرکھنے کا یہ اصول خود محدثین کے نزدیک مسلّم ہے (ابن جوزی نے اس کے متعلق بڑی صراحت سے لکھا ہے) لہٰذا پرویز صاحب کے خلاف یہ الزام محض انھیں بدنام کرنے کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس قسم کی بہتان تراشیوں سے ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے جذبات کو اس طرح مشتعل رکھا جائے کہ وہ قرآنی دعوت پر ٹھنڈے دل سے غور ہی نہ کر سکیں۔ اس تند و تیز جھکڑ میں اس مرد درویش نے جس سکوت اور سکون کے ساتھ قرآنی چراغ کو جلائے رکھا ہے اس کی مثال بھی مشکل مل سکے گی۔

لیکن پرویز صاحب کی مساعی ان مخالفتوں کی روک تھام تک ہی محدود نہیں رہیں۔ یہ ان کے ساتھ تعمیری کوششوں میں بھی مصروف ہے۔ انھوں نے ملک کو صحیح اسلامی نظام کا تصور دیا۔ انھوں نے قرآنی دستور پاکستان کا مسودہ مرتب کر کے حکومت کے سامنے رکھ دیا اور مجلس آئین ساز کے زیر غور مسودات کی غیر قرآنی شقوں میں سے ایک ایک کا تجزیہ کر کے قرآن کی روشنی میں بتا دیا کہ وہ کس طرح غلط تصورات پر مبنی ہیں۔ انھوں نے مجالس آئین ساز کے اراکین پر متعدد خطوط کے ذریعے اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ صحیح قرآنی دستور کے خط و خال کیا ہیں۔ انھوں نے پاکستان کے منظور کردہ آئین کا قرآن کی روشنی میں پورا تجزیہ کر کے دکھا دیا کہ جس دستور کو اسلامی کہا جا رہا ہے اس میں کس قدر حصہ غیر اسلامی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جب ایک گوشے سے یہ آواز بلند ہوئی کہ پاکستان کی قوم مسلم و غیر مسلم دونوں کے اشتراک سے مرتب ہوتی ہے، تو انھوں نے اسی جراءت و بصیرت کے ساتھ جس سے وہ تحریک پاکستان کے زمانے میں اس قسم کے دعاوی کا جواب دیا کرتے تھے اس آواز کی بھرپور مخالفت کی۔ بھرپور لیکن دلائل و براہین سے آراستہ۔ اس کے بعد جب لاء کمیشن کے تقرر کا سوال سامنے آیا تو انھوں نے مسلسل اور پیہم مقالات اور تقاریر سے اس حقیقت کو نمایاں کیا کہ اسلام میں قانون سازی کے اصول و مبادیات کیا ہیں اور اس میں قرآن۔ حدیث۔ فقہ۔ اجتہاد وغیرہ کا صحیح صحیح مقام کیا۔ یعنی انھوں نے دین کے ان تصورات کو جو صدیوں سے پیچیدہ اور ژولیدہ چلے آ رہے تھے، اور جوں جوں زمانہ گزرتا جا رہا تھا ان کی الجھنیں اور بڑھتی جا رہی تھیں، نکھار اور سنوار کر سامنے رکھ دیا۔ اور اس طرح لاء کمیشن کے لئے راستے کو اس طرح صاف اور ہموار کر دیا کہ اب اس کی گاڑی نہایت آسانی سے آگے چل سکتی ہے۔

آپ پورے پاکستان پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ کیا آپ کو کوئی اور شخصیت بھی ایسی نظر آتی ہے جس نے پاکستان کے تصور، اس کی تحریک اور قرآنی آئین و قوانین کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں اتنا کچھ کیا ہو؟ جب حقیقت یہ ہے تو پھر یہ کہنے میں کیا مبالغہ ہے کہ لاء کمیشن کی رکنیت پرویز صاحب کی عمر بھر کی مسلسل مساعی کی ایک فطری اور منطقی کڑی ہے۔ کیا کمیشن کو ان سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی اور بھی مل سکتی تھی جس کا علم۔ تجربہ اور قرآنی بصیرت کمیشن کے لئے اس قدر فائدہ کا موجب ہو سکتا؟ اگر کمیشن نے اس متاع گراں قدر سے کما حقہٗ استفادہ کیا تو اس کا وہ کام جو اس وقت اس قدر دشوار اور نازک دکھائی دے رہا ہے، نہ صرف یہ کہ بہت آسان ہو جائے گا بلکہ اس کے نتائج بڑے درخشندہ اور تابناک بن کر سامنے آئیں گے۔ جہاں تک پرویز صاحب کا تعلق ہے ان کے لئے کمیشن کی رکنیت نہ باعث فخر ہے نہ ذریعۂ منفعت۔ جہاں تک منفعت کا تعلق ہے وہ بہت پہلے اپنی گراں قدر مشاہرہ کی حامل ملازمت کو قبل از وقت ترک کر کے اپنا سارا وقت قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ جہاں تک مفاخرت کا تعلق ہے وہ قرآن کی نسبت کو اپنے لئے سب سے بڑا فخر سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ چیز خود کمیشن کے لئے وجۂ افتخار اور حکومت کے لئے باعث

اعزاز ہے کہ پرویز صاحب نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود کمیشن میں شمولیت کو منظور کرلیا ہے اور یہ محض اس لئے کہ یہ ان کے مشن ہی کی ایک کڑی ہے۔ حالانکہ اس سے ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔

بہرحال یہ امر موجب مسرت ہے کہ حکومت نے پرویز صاحب کو لاء کمیشن میں شامل کرکے اپنی دور نگہی اور جوہر شناسی کا ثبوت دیا ہے اور اس طرح ملک اور قوم کے لئے ان کی قرآنی بصیرت سے متعین طور پر متمتع ہونے کا موقعہ بہم پہنچایا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی۔ لیکن ظاہر ہے کہ کمیشن صرف قدامت پرستی نظریہ کی ترجمانی کے لئے وجود میں نہیں لایا گیا۔ اسے یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ اسلامی قوانین دور حاضر کے تقاضوں کو کس طرح پورا کرتے ہیں۔ باقی رہا اختلاف؛ سو خود قدامت پرست طبقہ کے جو نمائندگان کمیشن میں لئے گئے ہیں ان میں جو باہمی اختلافات ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لہٰذا اگر انہیں پرویز صاحب سے بھی کوئی اختلاف ہے تو یہ بات کونسی غیر معمولی ہے؟ اگر یہ اختلافات نہ ہوتے اور تمام ملت ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی مسلک کی متبع ہوتی تو اس قسم کے کمیشن کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ کمیشن کا کام یہ ہے کہ وہ ان اختلافات کو سامنے رکھتے ہوئے ملک کے لئے ایک متحدہ اور قابل عمل اسلامی ضابطہ قوانین کی سفارش کرے۔ کمیشن میں دس ممبر اور ایک چیئرمین ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی رائے کے اظہار کا مجاز ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے جو رائے دلائل و براہین اور علم و بصیرت پر مبنی اور نصوص سے مؤید ہوگی وہی قابل قبول ہوگی۔ عقائد و مسالک کا اختلاف اس میں کچھ اہمیت نہیں رکھے گا۔

بہرحال محترم پرویز صاحب کی یہ نئی ذمہ داری' ان کے سلسلہ کوہ کنی اور جوئے شیر آوری کی ایک اہم کڑی ہے۔ ہماری دلی دعا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ طلوع اسلام کے قارئین ہماری اس دعا میں برابر کے شریک ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس قدر زندگی اور صحت عطا فرمائے کہ جس عظیم کام کا انہوں نے بیڑہ اٹھایا ہے اس کی تکمیل ان کے ہاتھوں سے ہو جائے۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است!

مدیر
طلوع اسلام

اسلام میں

قانون سازی کا اصول

اس میں پاکستان کے علاوہ بعض دیگر ممالک اسلامیہ کے بلند پایہ مقننین کے افکار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں قانونِ شریعت کا کام کس نہج پر ہونا چاہیئے۔

یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ آپ اپنا نسخہ فوراً منگا لیجئے۔　　قیمت فی جلد مجلد دو روپے آٹھ آنے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۳/۱۵۹۔ ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی) کراچی ۲۹

شکریہ

پاکستان لاء کمیشن میں میرے تقرر پر بہت سے احباب کی طرف سے مجھے پیغامات تہنیت موصول ہوئے ہیں مجھے ان احباب کے مخلص جذبات کا احترام ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ ان سے میرے روابط قرآنی فکر سے ہم آہنگی کی بنا پر ہیں۔ اور جو تعلقات قرآنی رشتہ سے منوط ہوں وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام اور درخور تحسین ہوتے ہیں۔ ان احباب کی رفاقت میرے لئے وجہ ہزار مسرت و افتخار ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا۔ میں ان احباب سے معذرت خواہ ہوں کہ اپنی مصروفیات کی بنا پر ہر ایک کو فرداً فرداً جواب نہیں لکھ سکا۔ وہ اسی سپاس گذاری کو اپنے پیغام کا جواب تصور فرمالیں۔

لاء کمیشن میں میری شمولیت، میرے زندگی کے مشن ہی کی ایک کڑی ہے اس فرق کے ساتھ کہ اب میری ذمہ داریاں اور بھی زیادہ ہو جائیں گی۔ مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ ایک قانون ساز یا قانونی مشیر کی ذرا سی غلطی امت کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ اس لئے جب میں اس نئی ذمہ داری پر نگاہ ڈالتا ہوں، تو میرا دل لرز جاتا ہے۔ اور بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي. وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي. وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي. يَفْقَهُوْا قَوْلِي. كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا. إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا.

میں نے اس اہم ذمہ داری کو اس لئے قبول کر لیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ جو کام میں اس وقت تک نظری حیثیت سے کر رہا تھا، وہ اب ایک حد تک عملی شکل اختیار کر سکے گا اور اس سے قرآنی معاشرہ کی تشکیل میں آسانیاں ہو جائیں گی۔ یہی میری زندگی کا مقصود و منتہی ہے۔ اگر میں نے کسی وقت بھی دیکھا کہ یہ نیا فریضہ میرے قرآنی مشن کی تکمیل میں ممد و معاون ہونے کی بجائے (کسی وجہ سے) رکاوٹ بن رہا ہے تو میں اس سے بلا توقف الگ ہو جاؤں گا۔

آخر میں اس بارگاہِ ایزدی میں جھکی ہوئی پیشانی اور نم آلود آنکھوں سے بادیدۂ تر دعا ہے کہ

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ — در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ
سازی اگر حریف یم بیکراں مرا — با اضطراب موج سکونِ گہر بدہ
ذوقم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار — تیرے کہ نا فگندہ فتد کارگر بدہ

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

پرویز

طلوعِ اسلام کنونشن

(۱) صدر مرکزی بزم کی طرف سے جملہ بزمہائے طلوع اسلام کے نام اپیل

برادرانِ عزیز!

آپ میں سے جو احباب سال گذشتہ کی کنونشن میں شریک ہوئے تھے انہیں وہ سماں اب تک یاد ہوگا جب آخری دن قرآنی احباب ایک دوسرے سے گلے مل کر رخصت ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب پر یہ حسین آرزو کہ یا رب العالمین! وہ دن کب آئے گا کہ ہم پھر اسی طرح ایک جگہ جمع ہوں اور کچھ دنوں کے لئے ہی سہی اس محبت اور یگانگت کے نظارے سے اپنی آنکھوں کو سیراب کریں جو قرآنی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ایک سال کی جدائی کے بعد دوبارہ ملاقات کے دن قریب آ رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰ اکتوبر کو راولپنڈی میں طلوع اسلام کی دوسری کنونشن منعقد ہو رہی ہے۔ اس کے انتظامات بزم راولپنڈی نے اپنے ذمے لئے ہیں جس کے لئے وہ ہم سب کے شکریہ کی مستحق ہے۔ واضح رہے کہ کنونشن کا انعقاد کسی ایک شہر کی بزم کی ذمہ داری نہیں۔ ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ جس شہر کی بزم اس اہم ذمہ داری کو اپنے سر لیتی ہے وہ گویا ہمارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتی ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم کنونشن کو کامیاب بنانے میں ان کی پوری پوری مدد کریں۔ مختلف بزموں کو از خود ان سے پوچھنا چاہیئے کہ وہ اس ضمن میں کیا کام کر سکتی ہیں۔ اور پھر اس کام کو پوری توجہ سے سرانجام دینا چاہیئے۔

امید ہے آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس قسم کے اجتماعات قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور قرآنی معاشرہ کے قیام کے لئے فضا کو سازگار بنانے میں بڑے مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں کامیاب بنانا ہمارا اولین فریضہ ہے۔

(ڈاکٹر) حبیب الرحمٰن خاں

صدر۔ مرکزی بزم طلوع اسلام۔ کراچی

---

(۲) سیکرٹری بزم طلوع اسلام، راولپنڈی کی طرف سے ضروری یادداشت

انشاءاللہ کنونشن کا اجتماع ۱۸، ۱۹، ۲۰ اکتوبر کو بروز جمعہ، ہفتہ، اتوار راولپنڈی میں منعقد ہوگا۔ چونکہ راولپنڈی میں اکتوبر میں سردی شروع

ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسی لحاظ سے بستر اور کپڑے ساتھ لانے چاہئیں۔

(۲) حسب سابق کنونشن کے دوران میں کیمپ لائف ہوگی۔ یعنی ان تینوں دنوں میں شب و روز وہیں قیام کرنا ہوگا۔

(۳) رہائش اور خوراک کے جملہ انتظامات بزم کی طرف سے ہوں گے۔ جس کے جملہ اخراجات، بحساب بارہ روپے فی کس ادا کئے جائیں گے۔

(۴) مختلف بزموں کے نمائندگان کو بھی بحساب بارہ روپے فی کس خرچ ادا کرنا ہوگا۔

(۵) ہر بزم اپنی طرف سے کم از کم دو نمائندے بھیجے گی۔ ان کے علاوہ جو اراکین بطور مبصر شامل ہونا چاہیں وہ اس امر کی اطلاع اپنی بزم کی وساطت سے بھیجیں۔

(۶) اراکین بزم کے علاوہ، دیگر حضرات جو طلوع اسلام کے مشن سے متفق ہیں کنونشن میں شریک ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کی اطلاع بروقت موصول ہو جائے اور انہیں دعوت نامہ بھیجا جائے۔

(۷) بزموں کی طرف سے نمائندگان کے نام اور اراکین اور مبصرین کی طرف سے ان کی شمولیت کے ارادہ کی اطلاع، بزم طلوع اسلام راولپنڈی کو زیادہ سے زیادہ دس ستمبر تک پہنچ جانی چاہیئے۔ یہ نہایت ضروری ہے۔ اراکین کو شمولیت کی اطلاع متعلقہ بزم کی معرفت اور متفقین کو براہ راست بھیجی جائے گی۔ اس اطلاع نامہ کے بغیر کوئی صاحب کنونشن میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔

(۸) جملہ خط و کتابت ذیل کے پتہ پر کی جائے۔

محمد حنیف۔ سکرٹری بزم طلوع اسلام
"الکوثر" (بالمقابل گورنمنٹ زنانہ کالج)
مری روڈ۔ راولپنڈی

---

(۳) ناظم ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے

گذشتہ سال مختلف بزموں کی طرف سے محترم پرویز صاحب کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ کنونشن کے بعد ان کے ہاں تشریف لائیں۔ چونکہ اس امر کی اطلاع قبل از وقت نہیں دی گئی تھی اس لئے اکثر بزموں کو اس کی شکایت رہی کہ ان کی دعوت منظور نہیں کی گئی بنابریں درخواست ہے کہ جو بزمیں محترم موصوف کو اپنے ہاں بلانا چاہتی ہیں وہ اس کی اطلاع ذیل کے پتہ پر زیادہ سے زیادہ ۲۰ ستمبر تک بھیجدیں۔ آخری پروگرام کنونشن میں متعلقہ بزموں کے مشورہ سے مرتب کیا جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۳ (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی (۲۹)
۱۵۹۔ ایل

قرآن مجید میں
اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟

[شمس العلماء (مولانا) الطاف حسین حالی مرحوم]

(آج چاروں طرف سے یہ شور سنائی دے رہا ہے کہ پرویز صاحب قرآن کریم کے بعض الفاظ اور آیات کی جو تشریح و تفسیر بیان کرتے ہیں وہ تفسیر متقدمین کے ہاں نہیں ملتی اس لئے وہ رد کر دینے کے قابل ہے اور پرویز صاحب کا یہ طرز عمل دین میں فتنہ (اور نہ جانے کیا کیا) ہے۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے یہ اعتراض نیا نہیں۔ ہماری پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مسلمانوں میں جب بھی کسی صاحب علم و بصیرت نے اپنے غور و فکر سے کوئی ایسی بات کہی جو اسلاف کے ہاں نہیں ملتی تھی اسے ملحد و زندیق قرار دیدیا گیا اس لئے کہ ان قدامت پرستوں کے نزدیک ندرت فکر و خیال بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم میں لے جاتی ہے۔

جب اسی قسم کے اعتراضات سرسید کے زمانے میں اٹھائے گئے تو حالی مرحوم نے ان کے جواب میں ایک مفصل مضمون لکھا جو رسالہ معارف۔ علی گڈھ کی دسمبر ۱۸۹۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس مقالہ کو (غیر متعلقہ نظائر و حواشی کے حک کے بعد) درج ذیل کرتے ہیں۔

سرسید کے متعلق اس مقام پر اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج ہمیں پاکستان کی شکل میں جو خطۂ زمین میسر ہے اور جس میں ہمارے ارباب شریعت، اقامت دین اور نظام شریعت کی تنفیذ و ترویج کے خواہاں ہیں، یہ اسی مرد حق آگاہ و حقیقت شناس کی دور نگہی کا تصدق ہے۔ اگر اس وقت سرسید اتنی ہمت اور جرأت سے کام نہ لیتا (اور مولوی صاحبان کی اچھالی ہوئی کیچڑ سے مرعوب ہو جاتا) تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد ہندوستان میں بالکل اسپین کا نقشہ دکھائی دیتا۔

جہاں تک سرسید کی تفسیر کا تعلق ہے اسکے بیشتر مقامات سے ہمیں اختلاف ہے۔ لیکن جس اصول کے ماتحت اس نے تفسیر جدید کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ اس سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ علاوہ ازیں سرسید نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ غلطی سے بری اور وحی کی طرح واجب التسلیم ہے۔ اس کے برعکس اس نے اپنے ایک لیکچر میں (جو اسلام کے عنوان سے شائع میں دیا گیا تھا) اس کا اقرار کیا ہے کہ

میں معصوم نہیں اور نہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا ہے جس کے میں لائق نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو مگر آئندہ علما اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے۔ میرے خیال میں مخالفین اور مشککین فی الاسلام کے مقابلہ میں اسلام کی تائید اسی طریقہ پر ہو سکتی ہے اور کسی طریقہ پر نہیں ہو سکتی۔

بعینہٖ یہی کچھ آج پرویز اپنے متعلق کہتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ

اس حقیقت کو میں معارف القرآن کی سابقہ مجلدات میں بار بار پیش کر چکا ہوں۔ اور پھر اس کا اعادہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعوےٰ نہیں ہو سکتا کہ وہ سہو و خطا سے منزہ ہے یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے وہ قرآن کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے وہ میرے ذہن کی نارسائی ہے　　(معراج انسانیت ۔ فاتحۃ الکتاب)

نیز یہ کہ جو کچھ ہم قرآن سے آج سمجھ سکتے ہیں، وہ لامحالہ ہمارے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی ہو سکتا ہے جب زمانہ علمی اعتبار سے آگے بڑھ جائے گا تو اس کے لئے ہمارا فہم قرآن کافی نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دور میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ قرآن کے متعلق اس وقت سمجھا جا رہا ہے وہ حرفِ آخر ہے (سلیم کے نام ۔ نیز دیگر مقامات)

باقی رہے صاحبِ مضمون (جناب حالی) سو ان کے متعلق اس سے بہتر اور کیا کہا جائیگا جو اقبال کہہ گیا ہے

طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را　　　نوائے او بجانہا شور انگندے کہ من دارم

یہی عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح ہمارا مُلّا اس حالی کو منکرِ حدیث اور منکرِ شانِ رسالت قرار دیتا ہے جس نے حضور سرورِ کائنات کی شانِ اقدس میں وہ نعت کہی جس کا کوئی جواب نہیں۔ یعنی

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانیوالا　　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا　　　(الخ)

اسی طرح آج اس پرویز کو (معاذ اللہ) منکرِ شانِ رسالت کہا جاتا ہے جس نے سیرتِ طیبہ پر وہ کتاب (معراجِ انسانیت) پیش کی ہے جس کی مثال (کم از کم) اردو لٹریچر میں کم ملے گی۔

بہر حال یہ ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ اب آپ حالی کا مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔　　[طلوعِ اسلام]

سرسید کی تفسیر جس میں بیسیوں آیات کے معانی جمہور مفسرین کے خلاف لکھے گئے ہیں اس کی نسبت پہلا شبہ جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گذشتہ تیرہ سو برس میں وقتاً بعد وقتٍ قرآن مجید کی لکھی گئی ہیں اب تفسیر قرآن کے متعلق ایسا کونسا مرحلہ باقی رہ گیا ہے جس کو علمائے سلف نے طے نہ کر لیا ہو؟ اور آنحضرت رسولِ خدا صلعم نے جن کی برابر قرآن کا علم کسی امتی کو نہیں ہو سکتا جن آیتوں کے

معانی بیان کرنے کی ضرورت تھی خود زبان مبارک سے اُن کا مطلب ارشاد فرما دیا۔ پھر آپ کے بعد صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور علمائے اُمت نے جو یقیناً اس زمانے کے لوگوں سے بہتر قرآن کے معنی سمجھنے والے تھے۔ قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو بالکل حل کر دیا۔ پس زمانۂ حال کے مفسر کے لئے اس کے سوا کوئی منصب باقی نہیں رہا کہ وہ انہی تفسیروں کا حاصل جو علمائے سلف لکھ گئے ہیں زیادہ شرح و بسط یا زیادہ افضا یا زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دے۔ یا ایک زبان سے دوسری زبان میں اُن کا ترجمہ کر دے۔ یہ منصب اب کسی کا نہیں ہے کہ ایک بھی آیت کے معنی ایسے بیان کرے جو تیرہ سو برس میں کسی نے نہ بیان کئے ہوں: چنانچہ اسی شبہ کی بنا پر بعض ستم ظریفوں کو کہتے سنا ہے کہ جو مطلب قرآن کا سرسید نے بیان کیا ہے وہ نہ خدا کو سوجھا نہ نبی کو نہ صحابہ و تابعین کو اور نہ دیگر علمائے امت کو۔

اعتراض

اس مضمون میں ہم کو اسی شبہ کا حل کرنا مقصود ہے۔ مگر پہلے اس سے کہ اصل مقصود بیان کیا جائے چند باتیں ذہن نشین کر لینی ضروری ہیں ایک یہ کہ محکمات و متشابہات کے الفاظ جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں۔ اُن سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ

محکمات و متشابہات

کے نزدیک جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں مذکور ہے۔

محکمات وہ آیتیں ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو۔

متشابہات۔ وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن میں معانی متعددہ کا احتمال ہو سکتا ہے وہ سب متشابہات کے تحت میں مندرج ہیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا؟ امام رازی نے اس کی کئی وجہیں بیان کی ہیں۔ مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو انھوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ "قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص و عوام سب کو حق کی طرف بلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراک حقائق سے بعید ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر اُن کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے جو نہ جسم ہے نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اسکی طرف اشارہ ہو سکتا ہے تو ان کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ پس مقتضائے حکمت یہی تھا کہ ان کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو من وجہ ان کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں"

انداز تخاطب

شاہ صاحب نے اسی مطلب کو حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ "شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقایق علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل خلقت میں ودیعت تھی اُن سے خطاب کیا ہے اور اسی لئے (اُن کی سمجھ کے موافق) فرمایا الرحمن علی العرش استوی۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "آنحضرتؐ نے ایک حبشیہ عورت سے پوچھا کہ "خدا کہاں ہے؟ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا یہ مومنہ ہے۔ یعنی آنحضرتؐ نے باوجودیکہ آپ خدا تعالےٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے اس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اس کے ایمان کے لئے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ ذات اقدس جہت اور مکان سے پاک ہے۔

ان سب حوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کی فہم و ادراک سے اور خاص کر عرب کے امیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا اور ان کو مجاز و استعارہ اور تمثیل کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ اُمّی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کریں۔

عہد عتیق کی کتابیں جن کو مسلمان یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں چونکہ اس زمانے میں القا کی گئی تھیں جبکہ انسان کی سمجھ نہایت ابتدائی حالت میں تھی اس لئے ان میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز اور استعارے پر رکھی گئی ہے۔

اسی لئے شاہ ولی اللہ صاحبؒ انبیاء کے خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں "ومن سیرتھم ان لا یکلموا الناس الا علیٰ قدر عقولھم التی خلقوا علیھا وعلومھم التی ھی حاصلۃ عندھم باصل الخلقۃ"۔

متشابہات کی تاویل

تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضروری ہے کہ متشابہات کی تاویل جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے "وما یعلم تاویلہ الا اللہ" اس سے کیا مراد ہو؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح پر انسان کو نہیں دیا گیا ورنہ مسلمانوں کا یہ دعوےٰ غلط ہو جائے گا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث کی مانند کوئی ایسا راز سربستہ نہیں ہے جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں تاویل متشابہات کے متعلق لکھتے ہیں۔ "یبعد ان یخاطب اللہ عبادہ بما لا سبیل لاحد من الخلق الی معرفتہ وقد اتفق اصحابنا وغیرھم من المحققین علی انہ یستحیل ان یتکلم اللہ تعالیٰ بما لا یفید" یعنی بعید از عقل ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے ساتھ خطاب کرے جس کے معنی سمجھنے کی کوئی سبیل کسی مخلوق کے لئے نہ ہو اور ہمارے علمائے مذہب اور ان کے سوا اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالےٰ کا ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہونا جو مفید معنی نہ ہو محال ہے۔

غرضیکہ آیت مذکورہ کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو تاویل متشابہات کا علم قطعاً نہیں دیا گیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاص کر مبدا و معاد کے متعلق جو باتیں انسان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں، اور جن کا بیان آیاتِ متشابہات میں بطور مجاز و استعارہ کے واقع ہوا ہے اور جن پر ایمان لانے کو یومنون بالغیب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ان کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اور اس لئے انسان جن الفاظ و عبارات سے اُن حقائق کو تعبیر کرے گا وہ تعبیر ناقص اور ادائے معنیٰ مقصود سے قاصر ہو گی۔

طیبی شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ "المتشابہ الذی یحذر منہ ھو صفات اللہ تعالےٰ التی لا کیفیۃ لھا والاوصاف القیمۃ التی لا سبیل الی ادراکھا بالقیاس والاستنباط ولا سبیل الی استحضارھا فی النفوس" یعنی جن متشابہات کے اتباع سے بچنے کا حکم ہے وہ صفات باری تعالےٰ یا قیامت کے حالات کا بیان ہے جو قیاس اور استنباط سے دریافت نہیں ہو سکتا اور نہ لوگوں کو اس کا تصور دلانے کی کوئی سبیل ہے۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیات متشابہات میں وہ اسرار و حقائق بطور استعارہ یا تمثیل کے بیان

ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے۔ مثلاً سورۂ تکویر میں ہولِ قیامت کا بیان ان لفظوں میں کیا گیا ہے واذا العشار عطلت یعنی جبکہ عنقریب بیاہنے والی اونٹنیاں چھٹی پھریں گی اور ان کی کوئی خبر نہیں لے گا بے شک ہولِ قیامت کی جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے اس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہے اور اس کی قدرت سے باہر ہے کہ اُس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کر سکے لیکن یہ سمجھنا اس کی طاقت سے باہر نہیں ہے کہ یہ بیان اس کیفیت کی تمثیل ہے اور ایک اونٹ چرانے والی قوم جس کی دولت اونٹ اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی اس کو ہولِ قیامت کا تصور دلانے کے لئے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عرب اپنی الف و عادت کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اونٹنی بیاہنے کے قریب ہو اس وقت مالک اسکی نگرانی سے غافل ہو جائے۔ پس انھوں نے اس وقت کو کیسا ہولناک تصور کیا ہوگا جبکہ ایسی اونٹنیوں کی خبر گیری کا ہوش باقی نہ رہے گا۔

اسلاف کا مسلک

لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلف صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اس سے کس لئے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسل کو اتباعِ متشابہات پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلاوطن کر کے بصرے کو بھجوا دیا۔ اور جب امام مالکؒ سے استوا علی العرش کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیا کہ "استواء کے معنی معلوم ہیں اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے سوال کرنا بدعت ہے۔"

سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس وقت اہل کتاب تحریف کتب مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے وہ اکثر اپنے اغراض فاسدہ کے لئے کتب مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتلاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جابجا ان پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ خود اہل کتاب نے تسلیم کیا ہے کہ بلاشبہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائیبل کی کتابوں میں تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہو سکتی اور اہل کتاب اس کی مثال قائم کر چکے تھے اور چونکہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اصولِ دین میں عموماً باہمدگر مشابہت رکھتے تھے اس لئے مسلمانوں کا سب سے زیادہ میل جول اہل کتاب کے ساتھ تھا۔ لہٰذا ان میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چنانچہ منجملہ بہت سی بندشوں کے جو شارع نے اسلام میں انسدادِ تحریف کے لئے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیاتِ متشابہات کی معنی میں چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی اور قرآن میں صاف کہدیا گیا کہ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِيْلِهٖ اور آنحضرتؐ نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ من فسر القرآن

---

۱ یعنی جو حقائق انسانی عقل سے ماوراء ہیں اور ان کا بیان مجاز و استعارہ کی شکل میں ہوا ہے ان کی کنہ و حقیقت متعین کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ (طلوع اسلام)

برا یہ فلیتبوّ مقعدہٗ من النار اور جھوٹی روایت گڑھنے کی نسبت فرمایا کہ من کذب علی متعمداً فلیتبوّ مقعدہٗ من النار

اسکی وجہ

اسی بنا پر سلف صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ باوجودیکہ وہ تشبیہ کے عقیدے سے بالکل مبرا تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے اس سے حذر کرتے تھے پھر بھی جو آیتیں تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں اس کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے اور اُن کے ظاہری معنوں سے ہرگز متجاوز نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم آیاتِ متشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے اصلی معنوں کی جو خدا نے مراد رکھے ہیں تصدیق کرتے ہیں اور ان کا علم خدا پر چھوڑتے ہیں کیونکہ ان کو سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی۔ بعضے یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً ید یا وجہ یا استواء کا ترجمہ تک دوسری زبان میں نہیں کرتے تھے اور اگر کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو انھیں الفاظ کو بعینہٖ ترجمے میں رکھ دیتے تھے۔ حالانکہ عربی زبان جس میں شاعری نزولِ قرآن کے وقت حدِ کمال کو پہنچی ہوئی تھی استعارہ و کنایہ اور اقسامِ مجاز سے مالامال تھی اور اسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا۔ باوجود اس کے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہلِ اسلام میں مثل اہلِ کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے تاویلِ متشابہات اور تفسیر بالرائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا متشابہات قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں پر مقصور رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے ان کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کے تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اس کی مؤید نہ ہو عموماً مبادرت نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تفسیر بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک کہ اس کی تفسیر کسی حدیث سے ثابت نہ ہو بیان کرنے جائز نہیں ہیں۔ چنانچہ امام غزالی اور صاحب مجمع البحار اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرتؐ کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل نعوذ باللہ بیکار ٹھیرتا ہے۔ باوجود اس کے کہ سلف صالحین جہاں تک ہو سکتا تھا بغیر روایت کے سند تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے۔ تاکہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیر بالرائے کی ممانعت فرمائی ہے وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریف کا راستہ مسدود رہے۔

ہمارے زمانے کا تقاضا

لیکن یہ مصلحت اسی وقت تک محدود رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتم بالشان مصلحت پیش نہ آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں جب ان کے اصلی معنی بیان کرنے سے علما نے سکوت کیا اور ان کو محض حقیقی معنوں پر مقصور رکھا تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ عقیدۂ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفہ کا رواج زیادہ ہوتا گیا اسی قدر آیاتِ متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون و چرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے اب علمائے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلف صالح نے جو محض از راہ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی اس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں درحقیقت مجاز و استعارہ کے طور پر اطلاق کئے گئے ہیں بقدرِ ضرورت ان کے اصلی معنی صاف صاف بیان کئے جائیں۔

چنانچہ سب سے پہلے علمائے معتزلہ نے تاویل متشابہات کی راہ کھولی۔

آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلم ٹھیر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو نقل کے ایسے معنی لینے چاہئیں جن سے وہ تعارض

رفع ہو جائے۔ یعنی جب نص شرعی کے حقیقی معنی دلیل قاطع عقلی کے خلاف ہوں تو اس کو اصول عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہیے اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔

یہ اصول علم کلام کی عام کتابوں مثلاً مقاصد۔ مواقف۔ تفسیر کبیر در غرز تہافتہ الفلاسفہ اور فصل المقال قاضی ابن رشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ حمیدیہ حکمائے زمانہ حال کے مقابلہ میں لکھی ہے۔ اس میں بھی اس اصول کو قاعدہ مسلمہ اہل اسلام قرار دیا ہے بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جو معجزات حسیہ کو علوم جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں یہ ہدایت کی ہے کہ علیھم ان یقنعوا بما تقبلہ عقولھم وثم ما لم تقبلہ ویردہ البرھان العقلی القاطع یرجعون فیہ الی التاویل الجامع بین النقل والعقل (حمیدیہ صفحہ ۳۸) یعنی ان کو چاہیے کہ جس بات کو ان کی عقل قبول کرے اس پر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور برہان عقلی اس کے منافی ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جاتی ہے۔

پہلے بھی ایسا ہوا ہے

اگرچہ ابوالحسن اشعری جو کہ فرقہ اشاعرہ کے سرگروہ ہیں متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر ان کی یہ مخالفت صرف ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے مخصوص معلوم ہوتی ہے جن کے دل ہر قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہیں کیونکہ ضرورت کے وقت کیا معتزلی اور کیا اشعری اور کیا اور اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہات کتاب وسنت کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔ امام غزالی جو خود بھی اشعری المذہب ہیں رسالہ التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ میں لکھتے ہیں کہ اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو تاویل کا محتاج نہ ہوا ہو۔ سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبل ہیں۔ باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اس مقام پر ہم آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں کہ معلوم ہو جائے کہ آیات متشابہات کے معنی ابتداء میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم و حکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے ان کے کیا معنی قرار دیئے گئے۔

آیۃ الکرسی میں جو جملہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ آیا ہے اس کی تفسیر میں امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ کرسی کو پہلے ایک جسم عظیم (جو زمین و آسمان پر محیط ہے) سمجھا جاتا تھا۔ بعضے اسی کو عرش اور بعضے عرش و کرسی دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے۔ بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علماء کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ جہر سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش و کرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کئے جائیں۔

مزید تحقیق کی ضرورت

لیکن چونکہ اس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھی اس لئے بہت سے شبہات جو اس زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں اس زمانہ میں ان کا خطرہ بھی کسی کے دل میں نہیں گذرتا تھا۔ اور اس وجہ سے بہت سی آیات متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں ان کی تاویل کرنے کی ضرورت علمائے سلف کو محسوس نہیں ہوئی مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظ قرآنی میں شکوک وو سوسے نے راہ نہیں پائی لوگ ان آیتوں کے الفاظ کو جن

سے زمین کا مثل فرش کے بچھا ہوا ہونا مفہوم ہوتا ہے) ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے۔ اور اب تک بھی اُن ملکوں کے بعض علماء جہاں کسی زمانے میں یونانی فلسفے کا رواج نہیں ہوا زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں۔ مگر جب علم و حکمت کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور دلائل قاطعہ سے زمین کی کرویت ثابت ہوگئی تو علمائے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں جو زمین کی نسبت الفاظ فرشناھا اور دحاھا او طحٰھا اطلاق کئے گئے ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ اس وقت زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس کے درجے تک نہیں پہنچا تھا اس لئے قرآن کے بعض الفاظ جو زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسا سمجھا جاتا ہے جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چون و چرا نہیں کی لوگ اُن آیتوں کو ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے مگر جب دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مینہ درحقیقت آسمان سے نہیں برستا تو لفظ سماء جو قرآن میں جا بجا وارد ہوا ہے۔ اس سے مجازی معنی یعنی جانب فوق مراد لی گئی۔ لیکن چونکہ اس وقت یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسمان درحقیقت کوئی جسم محیط عالم مثل گول گنبد کے جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے نہیں ہے بلکہ تمام ثوابت اور سیارے فضائے بسیط میں بکھرے ہوئے اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت سے جس کا نام جاذبہ یعنی کشش ہے اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ اس لئے جو الفاظ کہ آسمان کے موجود ہونے یا مجسم ہونے پر بظاہر دلالت کرتے تھے ان کی کچھ تاویل نہیں کی گئی

اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بہت سے الفاظ ایسے باقی رہ گئے جن میں درحقیقت تاویل کی ضرورت تھی مگر چونکہ وہ ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوئی اس لئے ان کی تاویل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ اور سب سے بڑا مانع تاویل متشابہات پر جرأت کرنے کا یہ تھا کہ امام ابوالحسن اشعری جو تاویل متشابہات کے باب میں سلف صالح کے پورے مقلد تھے اور اس لئے اس کو بغیر اشد ضرورت کے جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے مذہب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ترقی کرنی شروع کی اور پانچویں صدی میں وہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا اور معتزلہ جنہوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفین اسلام کے مقابلہ میں سب سے پہلے تاویل متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور ان کو عند الضرورت واجب سمجھتے تھے جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کو ترقی ہوتی گئی اس قدر وہ اُن کا مذہب اور ان کے اصول اور اُن کی تصنیفات ناپید ہوتی گئیں۔ اکثر بادشاہوں نے جبراً اشعری مذہب کو رواج دیا اور معتزلہ کے اصول کا استیصال کیا۔ یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ دنیا سے معدوم ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تمام اسلامی دنیا میں زیادہ تر اشاعرہ کی تفسیریں پائی جاتی ہیں جن میں بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے دم نہیں مارا اور جس قدر تاویلات ان تفسیروں میں منقول ہیں اُن کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزلہ کی تفاسیر ہیں جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں صرف اُن کے اقوال حجۃ حجۃ اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ قفال جن کا قول کرسی کی تفسیر میں امام رازی نے نقل کیا ہے وہ بھی معتزلہ میں شمار کئے گئے ہیں۔

لہ شیخ حسین آفندی نے رسالہ تمہیدیہ میں اپنے زمانہ کے ایک تیسری عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دین اسلام میں امریکہ کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس سے زمین کی کرویت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہے۔ شیخ اسکی نسبت لکھتے ہیں کہ اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ ایک محسوس چیز کا انکار کردیں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں۔ ۱۲ حالی۔

اگرچہ امام ابوالحسن اشعری سے جیسا کہ علامہ شہرستانی نے ملل ونحل میں لکھا ہے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ عندالضرورت تاویل کرنی جائز ہے اور اسی بنا پر اشاعرہ بھی مثل دیگر فرقوں کے جہاں نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تاویل کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے وہ متشابہات کی تاویل پر حتی المقدور جرأت نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔ من اصول الدین ترک الخوض بالعقل فی المتشابہات من الکتاب والسنۃ اس کے بعد فرماتے ہیں ومن ذلک (ای من المتشابہات) امور کثیر لا یدری ارید بہ حقیقۃ الکلام او المجاز اقرب الیہا وذلک فی لم یجمع علیہ الا الامۃ ولم ترتفع فیہ الشبہۃ۔ یعنی قرآن اور حدیث میں از قبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں جن کی نسبت نہیں معلوم کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا ایسے مجازی معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں اور یہ تردد اُن بیانات میں ہے جن کی نسبت اجماع امت سے فیصلہ نہیں ہوا اور اشتباہ رفع نہیں ہوا۔

شاہ ولی اللہؒ کا مسلک

شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہے اور باوجودیکہ صدہا تفسیریں مبسوط لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ اُن مقامات پر جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کو محتمل ہیں ان سے درحقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔

قطع نظر اس محققانہ کلام کے جو شاہ صاحبؒ نے متشابہات کے باب میں لکھا ہے تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے دیگر حوالوں سے جو ہم پہلے دے چکے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کا کلام جو کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہوتا ہے اس کا طرز بیان ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر طبقہ اور ہر درجہ اور ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی معلومات کے موافق اس سے ہدایت پا سکیں۔ جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور اس کی سمجھ محض ابتدائی حالت میں ہو اس وقت بھی اسکی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو جو علم انسانی کے نہایت ترقی پر پہونچنے کے وقت حاصل ہو۔ ورنہ اس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور اس تقدیر پر امکان سے خارج ہے کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہے کلام الٰہی نئی نئی تفسیر والے سے بالکل مستغنی ہو جائے۔ کیونکہ جس قدر انسان پر حقائق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائیں گے اسی قدر کلام الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہوں گے۔

علامہ ابن الحاج اپنی مشہور کتاب "مدخل" میں لکھتے ہیں قال علیہ الصلوٰۃ والسلام فی القرآن لا تنقضی عجائبہ ولا یخلق علی کثرۃ الرد فعجائب القرآن لا تنقضی الی یوم القیٰمۃ فکل قرن لابد لہ ان یاخذ منہ فوائد جمۃ خصہ اللہ تعالےٰ بہا وضمہا الیہ برکۃ ھذہ الامۃ سائرۃ الی یوم الساعۃ:

قرآنی حقائق لامتناہی ہیں

یعنی "آنحضرت صلعم نے قرآن کے باب میں فرمایا ہے کہ" اس کے عجائب یعنی دقایق و اسرار جو اس میں مضمر ہیں ختم نہ ہوں گے اور وہ باوجود بار بار دہرانے کے پرانا نہ ہوگا۔ پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں اور اس لئے ہر زمانہ کے لوگوں کو چاہیئے کہ اُس سے فوائد کثیرہ جو اُن کے حصے میں آئے ہیں حاصل کریں

تاکہ اس امت کی برکت روز قیامت تک جاری رہے۔

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں "قال علیہ الصلوٰۃ والسلام مثل امتی کمثل المطر لا یدری اولہ خیر ام اخرہ۔ یعنی فی البرکۃ والخیر والدعوۃ الی اللہ تعالیٰ وتبیین الاحکام یعنی آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "میری امت کی مثال مینہ کی سی ہے جس کا نہیں معلوم اول بہتر ہے یا آخر" یعنی برکت اور خیر میں، لوگوں کو خدا کی طرف بلانے میں اور احکام الٰہی کے بیان کرنے میں۔

دونوں مذکورہ بالا حدیثوں سے جو علامہ ابن الحاج نے نقل کی ہیں صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور دقایق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور جس طرح امت کے اول قرنوں میں قرآن کے بہت سے دقایق واسرار امت پر ظاہر ہوئے ہیں اسی طرح اس کے اخیر قرنوں میں بہت سے دقایق واسرار دنیا پر منکشف ہوں گے۔

امام حجۃ الاسلام غزالیؒ اس باب میں لکھتے ہیں کہ کم من معانٍ دقیقۃ من اسرار القرآن یخطر علی قلب المتجردین للذکر والفکر یخلو عنہا کتب التفاسیر ولا یطلع علیہا افاضل المفسرین یعنی قرآن کے ایسے بہت سے دقایق واسرار جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسروں کو ان کی خبر نہیں ہوتی ان لوگوں کے دلوں پر کھلتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں۔

ابتدائی اعتراض کا جواب

(قرآن مجید میں مزید تفسیر کی گنجائش باقی نہیں ہے)

اوپر کے بیان سے غالباً اس بات میں کچھ شبہ نہ رہا ہوگا کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئی ہیں قرآن کی تفسیر سے ابھی استغنا نہیں ہوا۔ بہت سے مقامات اس میں اب بھی ایسے موجود ہیں جن کے معنی متعین نہیں ہوئے اور بہت سے عجائب اور دقایق واسرار ایسے باقی ہیں جو امت پر ہنوز منکشف نہیں ہوئے اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جن مقامات کی نسبت شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اجماع امت سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بولے گئے ہیں یا مجازی معنوں میں۔ آیا عند الضرورت اجماع امت کے خلاف ان مقامات میں خوض کرنا اور ان متشابہ الفاظ کے معنی متعین کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ اور اگر مناسب ہے تو اسلام کو اب ایسی ضرورت درپیش ہے یا نہیں کہ خرق اجماع پر مبادرت کی جائے اور جن متشابہات کے تاویل سے اب تک سکوت کیا گیا ان کے معنی صاف صاف بیان کئے جائیں۔

تقاضائے وقت

ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام پر اس قاعدے پر برابر عمل ہوتا چلا آیا ہے کہ ضرورتیں ممنوعات کو مباح وجائز کر دیتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ صحابہ اور تابعین کسی مسئلہ پر رائے اور قیاس سے گفتگو کرنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے۔ چنانچہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا چونکہ ان کو اس کے متعلق کوئی حدیث معلوم نہ تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں مکروہ جانتا ہوں اس بات کو کہ تیرے لئے حلال کر دوں جس

کو خدا نے حرام کیا ہے اور حرام کر دوں جس کو خدا نے حلال کیا ہے۔

ابن عمرؓ نے جابر بن زید فقیہ بصرہ سے کہا کہ قرآن و حدیث کے بغیر کوئی فتویٰ نہ دینا اگر تو نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہوگا اور اوروں کو بھی ہلاک کرے گا۔

ابو سلمہؒ جب بصرے میں آئے تو انھوں نے حسن بصری سے کہا کہ "میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتوے دیتے ہو سو کبھی بغیر قرآن و حدیث کے فتوے نہ دینا"

شعبیؒ سے کسی نے پوچھا کہ جب تم لوگوں سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو تم کیا کرتے تھے؟ انھوں نے کہا جب ہمارے مجمع میں کسی سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا تو وہ ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کے سوال کا جواب دو اور دوسرا تیسرے کی طرف۔ یہاں تک کہ پھر اول شخص تک سوال کی نوبت پہنچتی تھی۔ یعنی جب کسی کو اس مسئلہ کے متعلق کوئی روایت معلوم نہ ہوتی تھی تو جواب دینے سے سکوت کرتے تھے اور قیاس کو بالکل دخل نہ دیتے تھے۔

مگر آخر کار ضرورتوں نے قیاس کو ایسی ضروری چیز بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کا ہم پلہ اور دلائل شرعیہ سے ایک دلیل قرار دیا گیا۔

ایک زمانہ تھا کہ قدر کے مسئلہ پر گفتگو کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے کی مصلحت کے موافق اس مسئلہ میں خوض کرنے سے منع فرمایا تھا اور لوگوں کو قدر کے متعلق بحث کرتے دیکھ کر نہایت غیظ و غضب میں ارشاد کیا تھا کہ ابھذا امرتم ام بھذا ارسلت مگر جب ضرورت داعی ہوئی تو علماء کو چار و ناچار اس پر بحث کرنی پڑی۔ بنی امیہ کے عہد میں جب استحکام سلطنت کے لئے سخت خونریزیاں ہونے لگیں اور ارکان سلطنت سے لوگوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ مسلمان کیوں قتل کئے جاتے ہیں؟ تو ان کو یہ جواب ملا کہ القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ آخر کار علماء کو یہ عقدہ حل کرنا پڑا اور اس قدر کے معنی بتلانے پڑے اور یہ مسئلہ علم کلام کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ قرار دیا گیا۔

متشابہات کی تاویل میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جب تک شک اور وسوسے کا زمانہ نہیں آیا کسی نے دم نہیں مارا مگر آخر کار اس زمانے کی ضرورتوں کے موافق علماء کو تاویل پر مبادرت کرنی پڑی اور یہ بات قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام الہامی کتابیں اور صحیفے جو انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئے چونکہ ان میں کثرت سے آیات متشابہات وارد ہوئی تھیں اس لئے اگرچہ ایک مدت دراز تک لوگ ان کو حقیقی معنوں پر محمول کرتے رہے مگر جس قدر علم انسانی ترقی کرتا گیا اسی قدر اُن کے مجازی معنی جو اصل مقصود تھے منکشف ہوتے گئے۔

قرآن مجید میں جو الفاظ یا آیتیں اب تک ایسی موجود ہیں جن کی نسبت بقول شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ ان کے معنی متعین کرنے کا وقت اب آ پہنچا ہے تو اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اٹھا دیا جائے اور جو معنی اصول عربیت کے موافق ایسے قرار پائیں جن سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے رفع ہو جائے تو بلا تامل وہی معنے اختیار کئے جائیں اگرچہ تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے وہ معنی نہ لکھے ہوں۔

مگر سوال یہ ہے کہ آیا ایسی ضرورت سردست درپیش ہے جو محظورات کو مباح کر دیتی ہے؟ سوال کا جواب یہ ہے کہ

بینا و نابینا جو لوگ زمانے کے حال سے بے خبر ہیں اور جن کے کان میں مخالفت کی کوئی آواز نہیں پہنچی اُن کے نزدیک تو اس کے سوا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ جو شخص جمہور کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالے اس کو فوراً دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے ان کے حال پر تو یہ شعر صادق آتا ہے کہ

آفاتِ بحر سے ہیں نا واقفِ آشناب ہنستے ہیں ناخدا پر رونا ہے ناخدا جب

مگر وہ لوگ جو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم جس قدر دنیا میں زیادہ پھیلتی جاتی ہے۔ اسی قدر مذہبی عقائد اور مذہبی خیالات لوگوں کے دلوں سے کافور ہوتے جاتے ہیں ان کو وہ ضرورت روزِ روشن کی طرح نظر آتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ جس ضرورت نے حکمائے اسلام یعنی قدیم متکلمین کو سلف صالح کے برخلاف تاویلِ متشابہات پر مجبور کیا تھا وہ ضرورت ہمارے زمانے میں حدِ غایت کو پہنچ گئی ہے۔ اس زمانے میں حکمت اور فلسفہ خاص کر علماء و مصنفین کے گروہ میں محدود تھا جو معقولات کو زیادہ تر منقولات کی تقویت اور دین کی حمایت کے لئے حاصل کرتے تھے مگر اس زمانے میں مغربی تعلیم ضروریاتِ زندگی میں داخل ہو گئی ہے۔ ہر شخص عام اس سے کہ نوکری پیشہ ہو، تاجر ہو یا اہلِ حرفہ ہو مجبور ہے کہ اولاد کو مغربی تعلیم دلوائے اور اس لئے مغربی علوم کی تعلیم مذہب کے حق میں بہ نسبت یونانی علوم کے زیادہ خطرناک ہو گئی ہے اس کے سوا اس زمانے کے علوم زیادہ تر محض قیاسات پر مبنی تھے اور اس لئے جو شبہات ان سے مذہب کی نسبت پیدا ہوتے تھے ان کے دفیعے کے لئے اکثر حالتوں میں صرف "لا نسلم" کہہ دینا کافی تھا۔ مگر اس زمانہ میں علم کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ اور استقراء پر رکھی گئی ہے اور اس لئے جو شکوک اب مذہب کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں وہ صرف لا نسلم کہہ دینے سے رفع نہیں ہو سکتے۔

غرضیکہ گزشتہ اور موجودہ صدی میں علم و حکمت نے بے انتہا ترقی کی ہے۔ ہزاروں باتیں جو پہلے معلوم نہ تھیں اب معلوم ہوئی ہیں۔ بہت سے باتیں جو پہلے صحیح مانی جاتی تھیں اب غلط ثابت ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو پہلے ممکن الوقوع مانی جاتی تھیں۔ اب غیر ممکن الوقوع مانی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

اگرچہ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ زمانۂ حال کے اکثر مسلمات غلط ثابت ہو جائیں لیکن چونکہ حال کی تحقیقات کا مدار صرف قیاسی اور ظنی باتوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر تجربہ اور مشاہدہ پر ہے اس لئے بہت ہی کم احتمال اس بات کا ہے کہ جو علوم اور مسائل سائنس کے درجے تک پہونچ گئے ہیں ان میں آئندہ کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو۔ پس جو باتیں قرآن میں بظاہر زمانۂ حال کی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں جب تک کہ اس تحقیقات کو غلط ثابت نہ کیا جائے ضروری ہے کہ یا تو قرآن کو حقائقِ محققہ کے برخلاف تسلیم کریں اور یا اس کے ایسے معنی بیان کریں جو زمانۂ حال کی تحقیقات کے برخلاف نہ ہوں۔[1] مگر ہم قرآن میں بہت سی ایسی آیاتِ متشابہات پاتے ہیں کہ اگر ان

---

[1] طلوعِ اسلام کا اس باب میں مسلک یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ مسئلۂ زیرِ نظر کے متعلق جو کچھ ہمارے زمانے نے معلوم کیا ہے وہ حرفِ آخر نہیں ہے۔ اس باب میں مزید تحقیق کا انتظار کرنا چاہیئے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہو گی تو اس کی تحقیق یقیناً قرآن کی تائید کرے گی۔

کو مجازی معنوں پر محمول کیا جائے تو ہم کو اصولِ عربیت کے خلاف تکلفات لایعنی کرنے پڑتے ہیں اور نہ قرآن کے اسلوب بیان سے تجاوز کرنا لازم آتا ہے۔ اور باوجود اسکے زمانۂ حال کے شبہات جو اُن آیتوں کی قدیم تفسیر پر وارد ہوتے ہیں بالکل رفع ہو جاتے ہیں اور اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان آیتوں کو صرف اس خیال سے کہ جمہور مفسرین نے ان کو ہمیشہ حقیقی معنوں پر مقصور رکھا ہے ہم مجازی معنوں پر محمول نہ کریں۔

یہ جدت طرازیاں؟

جو لوگ سرسید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ

جو معنی قرآن کے انھوں نے لکھے ہیں نہ وہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔ سو شاید سرسید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو مگر ان کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہے۔

یہ بات تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو معنی سرسید نے قرآن کے بیان کئے ہیں وہ خدا اور خدا کے رسول کو سوجھے تھے یا نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ ان معنوں کا اس زمانے میں جبکہ قرآن نازل ہوا مخاطبین پر ظاہر کرنا شارعؑ کے مقصود کے بالکل برخلاف تھا۔

ہم اوپر بحوالہ تفسیر کبیر اور حجۃ اللہ البالغہ کے لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انسان کی سیدھی سادی سمجھ کے موافق (جو علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اس کی خلقت میں ودیعت تھی) خطاب کیا گیا ہے اور بہت سے حقائق مجاز، استعارہ و تمثیل کے پیرایے میں بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ جب تک مخاطبین اپنی عقلِ طبعی سے ترقی کر کے علم و حکمت کے اعلیٰ درجہ تک نہ پہنچیں اس وقت تک جو معنی اُن الفاظ سے بظاہر متبادر ہوں انہی پر قانع رہیں، مگر جوں جوں حقائقِ اشیاء ان پر منکشف ہوتے جائیں اسی قدر ان الفاظ کے معنی مقصود ان پر کھلتے جائیں۔ پس جو معنی قرآن کے اب یا آئندہ ایسے بیان کئے جائیں جو اصولِ عربیت اور اسلوب قرآن کے خلاف نہ ہوں اور باوجود اس کے ان کے اختیار کرنے سے کوئی اعتراض جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے بخوبی رفع ہوتا ہو اس کی نسبت صرف اس بنا پر کہ نزولِ قرآن کے وقت شارع نے ان کو بیان نہیں کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ یعنے نہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔

صاف بات

قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جبر پر اور بہت سی قدر پر دلالت کرتی ہیں۔ مگر آنحضرت صلعم نے مسئلہ جبر و قدر کی نسبت اس کے سوا کچھ نہیں فرمایا کہ لوگوں کو اس پر بحث کرتے دیکھ کر نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا۔ باوجود اس کے جب ضرورت داعی ہوئی تو صحابہ ہی کے وقت میں اس پر بحث شروع ہو گئی۔ چنانچہ عمرو بن عاص اور ابو موسیٰ اشعری میں جو اس مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوئی وہ ملل و نحل شہرستانی میں مذکور ہے اور پھر مفسرین اشاعرہ نے بمقابلہ معتزلہ کے ان آیات کی تفسیر میں جو جبر یا قدر پر دلالت کرتی ہیں اس مسئلہ پر کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہیں چھوڑا۔ پھر کیا کوئی اشعری یہ کہہ سکتا ہے کہ جو معنی ان آیتوں کے ہمارے علماء اور ائمہ نے بیان کئے ہیں وہ خدا کو سوجھے نہ خدا کے رسول کو۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے صرف اس قدر ثابت کرنا مقصود تھا کہ قرآن مجید میں باوجود بیشمار تفسیروں کے جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں اب تک نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ:-

سرسید نے جن آیتوں کی تفسیر جمہور مفسرین کے خلاف لکھی ہے وہ کہاں تک اصول عربیت اور اسلوب قرآن کے موافق ہے؟

جن اعتراضات کو رفع کرنے کی غرض سے انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے ان کے رفع کرنے کی فی الواقع ضرورت ہے یا نہیں؟

جو معیار قرآن کے الہامی ہونے کا انھوں نے قرار دیا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا معیار قرار پا سکتا ہے یا نہیں؟ سو ان عنوانوں پر ہم آئندہ اپنے خیالات ظاہر کریں گے[1]۔ وما توفیقی الا باللہ۔

---

[1] یہ مزید بحث ہماری نظر سے نہیں گذری۔ نہ ہی اس کی اب چنداں اہمیت باقی ہے۔ (طلوع اسلام)

اسلام میں

قانون سازی

کا اصول

اس میں پاکستان کے علاوہ بعض دیگر ممالک اسلامیہ کے بلند پایہ مقننین کے افکار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں قانون شریعت کا کام کس نہج پر ہونا چاہیئے۔

یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ آپ اپنا نسخہ فوراً منگا لیجیئے۔

قیمت فی جلد۔ مجلد دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ۔ ناظم ادارۂ طلوع اسلام

۱۵۹/۳ ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

قرآنی انقلاب کا صحیح تصور

ان کتابوں سے پیدا ہو سکیگا

معراجِ انسانیت حضور صلعم کی ذاتِ اقدس و اعظم شرف و مجد انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھی۔ اسے قرآنی آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سیرتِ مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات، ملائکہ، وحی، شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کے لئے سلسلۂ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے۔

جوئے نور کاروانِ نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت دس روپے

سلیم کے نام خطوط مذہب کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا نہایت شگفتہ اور شاداب جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے۔

فردوسِ گم گشتہ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب۔ بڑے سائز کے ۴۱۶ صفحات قیمت چھ روپے۔

نظامِ ربوبیت نوعِ انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقلِ انسانی نے کیا سوچا؟ اور قرآن نے اس کا کیا حل بتایا ہے۔ دورِ حاضر کی عظیم کتاب بڑا سائز ضخامت ۴۰۰ صفحات قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے

اسبابِ زوالِ امت (دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۷۲ صفحات قیمت دو روپے

(یہ تمام کتابیں محترم پرویز صاحب کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہیں)

ملنے کا پتہ:۔ **ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۱۵۹/۳- ایل (پی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹**

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ پیسٹ
MISWAK
Tooth Paste
MAKES TEETH PEARLY WHITE
MISWAK
WAX

مجلسِ اقبال

مثنوی رموزِ بیخودی

تمہید۔ در معنیٔ ربطِ فرد و ملت

سابقہ اشاعت میں مثنوی رموزِ بیخودی کی "پیشکش" ہمارے سامنے آچکی ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے اور اس میں فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کی وضاحت کی گئی ہے (جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے) عمرانیت اور اجتماعیت کا بنیادی سوال یہ ہے کہ فرد اور سوسائٹی کا باہمی رابطہ کیا ہے؟ کیا سوسائٹی کا وجود فرد کے لئے ہے یا فرد محض سوسائٹی کے قیام اور بقا کا ذریعہ ہے۔ رموزِ بیخودی اساساً (بنیاداً) اسی اہم سوال کا جواب ہے۔ زیرِ نظر باب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

فرد را ربطِ جماعت رحمت است

جوہرِ او را کمال از ملت است

سب سے پہلی اور اصلی بات یہی ہے کہ فرد الگ رہ کر اپنی ذات کی نشوونما کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے وہ معاشرہ۔ سوسائٹی یا جماعت کا محتاج ہے۔ اگر اسے ایسی جماعت میسر آجاتی ہے تو وہ اس کے لئے وہی کام کرتی ہے جو ایک جنین کی پرورش کے لئے رحمِ مادر کام کرتا ہے۔ فرد کی پرورش اور نشوونما اسی قالب کے اندر رہ کر ہو سکتی ہے۔ اگر اسے جماعت میسر نہ آئے تو اس کے جوہر مضمر اور خوابیدہ رہ جائیں۔ ان کی کبھی تکمیل نہ ہو سکے۔ لہذا

تا توانی با جماعت یار باش

رونقِ ہنگامۂ احرار باش

جہاں تک ہو سکے ضروری ہے کہ تو جماعت کے ساتھ رہے۔ لیکن یہ جماعت ان افراد پر مشتمل ہونی چاہیئے جن میں کا ہر فرد آزاد ہو، کوئی کسی دوسرے کا محکوم اور محتاج نہ ہو۔ اس لئے کہ حریت (آزادی) انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اگر کوئی جماعت ایسی ہے جس میں کچھ افراد دوسرے افراد کے محکوم اور غلام ہیں، تو وہ جماعت ایسی نہیں ہوگی جس میں انسانی ذات کی تکمیل ہو سکے۔ اس سے آگے دیکھا جائے تو جہاں ایک طرف فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ جماعت کے تحت رہے وہاں فطری طور پر جماعت کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ افراد کی آزادی کو برقرار رکھے۔ برقرار ہی نہ رکھے بلکہ اسے بڑھاتی چلی جائے۔ یہی وہ جماعت ہے جس کے متعلق نبی اکرمؐ

نے فرمایا کہ جو جماعت سے الگ ہوا اُسے شیطان اچک کر لے گیا اور وہ جہنم میں جا گرا۔ اس لئے

حرزِ جاں کن گفتہ خیر البشر
ہست شیطان از جماعت دور تر

حضورؐ کا یہ فرمان بطور حرزِ جاں اپنے ساتھ رکھو کہ اگر انسان تنہا ہو تو اسے شیطان جھپٹ لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ جماعت کے ساتھ ہو تو شیطان اس سے دور دور رہتا ہے۔

فرد قوم آئینہ یک دیگر اند
سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند

فرد اور قوم کا باہمی تعلق کیا ہے؟ تعلق یہ ہے کہ نہ افراد کے بغیر قوم کا کوئی وجود ہوتا ہے۔ نہ قوم کے بغیر افراد میں کوئی وجہ جامعیت ہو سکتی ہے افراد اگر موتی ہیں تو قوم موتیوں کی مالا ہے۔ افراد ستارے ہیں تو قوم کہکشاں ہے۔ آپ دیکھئے کہ مالا، موتیوں ہی کا مجموعہ اور کہکشاں ستاروں ہی کا ہجوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مالا اور کہکشاں اپنا الگ وجود رکھتی ہیں۔ بایں ہمہ اگر موتی نہ ہوں تو مالا کا وجود نہ ہے۔ اگر ستارے نہ ہوں تو کہکشاں کہیں دکھائی نہ دے۔

نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قسم کے موتی ہوں گے اسی قسم کی مالا ہو گی۔ اور جس قسم کی مالا ہو گی اسی قسم کے موتی ہوں گے۔ ہو نہیں سکتا کہ مالا بیش قیمت ہو اور موتی خرف ریزے۔ یا موتی محض صدف پارے ہوں اور مالا بے بہا قرار پا جائے۔ اس لئے فرد اور جماعت ایک دوسرے کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

یہ اس لئے کہ

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

فرد کا احترام ملت کے ساتھ وابستگی میں ہے۔ اور ملت کا وجود افراد کے نظم و نسق سے ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ فلہٰذا

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب تسلیم شود

تصوف میں وحدت الوجود کا نظریہ یہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو ذاتِ باری تعالےٰ میں فنا کر دے اور اس طرح جزو اپنے کُل سے مل کر کل بن جائے۔ بقول غالب

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

لیکن اقبال اس نظریہ کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصود انسانی ذات کو فنا کرنا نہیں بلکہ اسے اس قدر مستحکم کرنا ہے

کہ یہ خدا کی ذات میں بھی جذب نہ ہو سکے۔

بخودِ محکم گذار اندر حضورش

مشو ناپید اندر بحرِ نورش

لیکن یہ استحکام خودی اسی طرح ہو سکتا ہے کہ فرد اپنے آپ کو جماعت کے اندر گم کر دے اور اس طرح یہ قطرہ سمندر بن کر حدود فراموش و قیود ناآشنا ہو جائے۔ غالب نے وحدت الوجود کے تصور کے ماتحت کہا تھا کہ

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اقبال بھی وہی تشبیہات اور استعارات استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس کا مفہوم وحدت الوجود کے مفہوم سے یکسر مختلف ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ (جیسا کہ ہم سابقہ اشاعت میں لکھ چکے ہیں) فرد کا "جماعت کے اندر گم ہو جانا" شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔ ورنہ درحقیقت فرد اپنی ہستی کو جماعت میں گم نہیں کرتا۔ یہ جماعت کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ اور اس تعاون میں —— من تو شدم تو من شدی —— کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ہر فرد، دوسرے افراد کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے۔ اور یہی بات اس کی ذات کی نشوونما اور استحکام و استقرار کا ذریعہ بنتا ہے۔

جب فرد اس طرح جماعت کے ساتھ مل جاتا ہے تو

مایہ دارِ سیرتِ دیرینہ او | رفتہ و آئندہ را آئینہ او
وصلِ استقبال و ماضی ذاتِ او | چوں ابد لا انتہا اوقاتِ او

فرد بجائے خویش قوم بن جاتا ہے اور قوم کی تمام خصوصیات کا حامل ہو جاتا ہے۔ فرد تنہا ہے تو اس کی زندگی ایک معینہ مدت پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن قوم پیچھے سے مسلسل چلی آتی ہے اور مسلسل آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اس فرد کی ذات میں ماضی اور مستقبل دونوں سمٹ کر آجاتے ہیں۔ وہ قوم کی ماضی کے تمام سرمایہ کا وارث ہوتا ہے اور اس کے مستقبل کی تعمیر کا ضامن۔

در دلش ذوقِ نمو از ملت است

احتسابِ کارِ او از ملت است

جب کاروانِ ملت، شاہراہِ حیات پر قدم بڑھاتا ہوا آگے چلتا ہے تو اس ملت کے ہر فرد کے دل میں بڑھنے اور بلند ہونے کا ذوق بیدار ہوتا ہے۔ اب اس کا ہر عمل ایسے نتائج مرتب کرتا ہے کہ اگر اس سے وہی عمل، جماعت سے الگ رہ کر ظہور پذیر ہوتا تو اس سے وہ نتائج کبھی برآمد نہ ہوتے۔ جماعت کی نفسیات درحقیقت بڑی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے۔ جماعت، افراد ہی کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ لیکن جماعت کی قوت، افراد کی قوت کے مجموعہ (Sum-total) کا نام نہیں ہوتی۔ اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ایک اکیلا اور دو گیارہ۔ تو یہ محض محاورہ نہیں۔ ایک حقیقت کی ترجمانی ہے۔ ایک اور ایک کی مجموعی قوت، دو کے برابر نہیں ہوتی۔ دو سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ جس طرح مشین کی قوت، اس کے پرزوں کی قوت کے مجموعہ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اور جب قوم کی قوت، افراد کی مجموعی قوت

سے زیادہ ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم سے وابستگی کے بعد، خود فرد کی قوتوں میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ فرد، فرد نہیں رہتا خود قوم بن جاتا ہے۔

پیکرش از قوم و هم جانش ز قوم
ظاهرش از قوم و پنهانش ز قوم

قوم ہی اسے پیکر عطا کرتی ہے اور قوم ہی اسے زندگی بخشتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن سب قوم کی تخلیق ہوتا ہے۔

در زبانِ قوم گویا می شود
بر رهِ اسلاف پویا می شود

وہ بات کرتا ہے تو قوم کی زبان میں کرتا ہے۔ وہ چلتا ہے تو قوم کے راستے پر چلتا ہے۔

پختہ تر از گرمیِ صحبت شود
تا بمعنی فرد هم ملت شود

جس طرح لوہا آگ میں تپانے سے کچھ وقت کے بعد آگ بن جاتا ہے، اسی طرح فرد قوم کی معیت سے قوم بن جاتا ہے اور اس میں قوم کی سی پختگی آجاتی ہے۔ یوں سمجھئے گویا اس مقام پر فرد کے معنی ہی قوم ہو جاتے ہیں۔

وحدتِ او مستقیم از کثرت است
کثرت اندر وحدتِ او وحدت است

فرد اپنی ذات میں واحد بے چون اور یگانہ (Unique) ہوتا ہے لیکن اس کی یہ وحدت اور یگانگی، افراد (کی کثرت) کے اندر قائم اور متوازن رہتی ہے۔ دوسری طرف افراد کی کثرت ہر فرد کی وحدت کا جزو بن کر ایک وحدتِ کلی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ا۔ ب ایک خطِ مستقیم ہے۔ چونکہ یہ ایک خط ہے اس لئے اسے واحد کہیں گے۔ لیکن خطِ مستقیم ہوتا کیا ہے؟ خطِ مستقیم متحرک نقاط کے راستے کو کہتے ہیں[1]۔ اس طرح کثرت، وحدت میں گم ہو جاتی ہے۔ یا مثلاً

لفظ چوں از بیتِ خود بیروں نشست
گوہرِ مضموں بجیبِ خود شکست

مصرعہ الفاظ ہی کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس میں سے ایک لفظ بھی اپنے مقام سے ادھر ادھر سرک جائے تو اس کا سارا مضمون درہم برہم ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب اس طرح کوئی مصرعہ مہمل ہو جائے تو اس کا ہر لفظ مہمل ہو جائے گا۔ حالانکہ انفرادی طور پر ان الفاظ کے معانی اب بھی وہی ہوں گے جو پہلے تھے۔

---

[1] Straight Line Is The Path Of Moving Point

بانگِ درا کی ایک نظم میں، اقبال نے فرد اور ملت کو پتے اور شاخ سے تشبیہ دے کر کہا ہے کہ خزاں کے موسم میں جب شاخ سوکھ جائے تو جو پتے اُس وقت بھی اس کے ساتھ پیوستہ رہیں، انھیں اس کی امید ہو سکتی ہے کہ موسم بہار میں انھیں پھر سے تازگی اور شادابی مل جائے گی لیکن جن پتوں نے شاخ سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا اور جھڑ کر اس سے الگ ہو گئے، انھیں بہار کے موسم میں حیاتِ نو کی کوئی امید نہیں ہو سکتی بہار میں وہ سارا درخت ہرا بھرا ہو جائے لیکن گرے ہوئے پتوں کا اس تازگی میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے افرادِ ملت سے اقبال کا پیغام یہ ہے کہ

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اس مضمون کو انھوں نے مثنوی میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ

برگِ سبزے کز نہالِ خویش ریخت
از بہاراں تارِ امیدش گسیخت

جو پتہ درخت سے گر گیا، اس کے نصیب میں بہار کی آرزو، حیاتِ نو نہیں ہو سکتی۔

ہر کہ آب از زمزمِ ملت نخورد
شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد

جس فرد نے ملت کے چاہِ زمزم سے آبِ حیات نہ پیا، اس کے بربطِ ہستی میں نغموں کے شعلے بجھ کر رہ گئے۔ فرد کے لہو میں جوش، اس کے جگر میں حرارت۔ اس کے سینے میں ولولے۔ اس کے بازوؤں میں قوت سب ملت کے ساتھ وابستگی سے پیدا ہو

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

زندگی تخلیقِ مقاصد کا نام ہے۔ لیکن تنہا فرد تخلیقِ مقاصد کر ہی نہیں سکتا وہ بے مقصد جیتا ہے اور بے مقصد مر جاتا ہے۔ اور اس کی قوتیں (Diffused) اور اسکی توانائیاں (Disintegrate) ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ان سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہوتا جب وہ جماعت سے وابستہ ہو جاتا ہے تو

قوم با ضبط آشنا گرداندش
نرم رو مثلِ صبا گرداندش

قوم اس کی بے مقصد نقل و حرکت کو نظم و ضبط کے دائرے میں لا کر اس کے لئے ایک سمت متعین کر دیتی ہے۔ وہ اس کی قوتوں کے جھکڑ میں اعتدال پیدا کر کے اسے مثلِ نسیمِ سحری نرم رو بنا دیتی ہے۔

اقبال نے یہاں ایک بڑی اہم حقیقت بیان کی ہے۔ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت حریت، اور آزادی ہے لیکن یہ

حریت اُسے اسی صورت میں نصیب ہو سکتی ہے جب اس کی ذات کی باقاعدہ نشوونما ہو جائے۔ ذات کی نشوونما ہو نہیں سکتی جب تک انسان اپنے آپ پر خود پابندیاں عائد نہ کرے۔ یہ خود عائد کردہ پابندیاں (Self-imposed Restrictions) کسی غیر کی محکومی نہیں ہوتی بلکہ اپنے آپ کو ضبط کا خوگر Self-Disciplined بنانے کی تدبیر ہوتی ہے۔ اس سے انسان کی منتشر اور پریشان قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اس کی سرکشی، آئین کی پابند ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وہی قوتیں جو تخریب میں صرف ہو رہی تھیں، تعمیری نتائج کی ضامن بن جاتی ہیں۔ پانی جب تک دریا کے ساحلوں کے اندر پابند رہ کر بہے، وجہ سیرابیٔ عالم ہوتا ہے۔ لیکن جونہی وہ ساحل توڑ کر بدلگام ہو جائے تو سیلاب بن جاتا ہے جس کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہوتا ہے۔ وہی ہوا جو ایک خاص سمت میں خاص رفتار سے چلے تو کشتیوں کو ساحلِ مراد تک لے جانے کا ذریعہ ہوتی ہے، جب سمت و رفتار سے نا آشنا ہو کر آندھی اور جھکڑ بن جائے تو بڑے بڑے جہازوں کو غرق کر دیتی ہے۔ سفر اور آوارگی میں فرق کیا ہے؟ یہی کہ سفر ایک متعین منزل کی طرف گامزن ہونے کا نام ہے اور آوارگی، بلا تعینِ منزل، جادہ پیمائی اور صحرا نوردی۔ نتیجہ یہ کہ مسافر شام کو منزل کے قریب ہوتا ہے اور آوارہ پھرنے والا تھک تھکا کر بھی وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات اپنے مستقر سے بھی دور چلا جاتا ہے۔

فرد کی قوتیں، ساحل نا آشنا سیلاب یا آوارہ صفت آندھی اور جھکڑ کی طرح ہوتی ہیں۔ جماعت ان قوتوں کو آئین کی پابندی سے یکسر تعمیری نتائج کا موجب بنا دیتی ہے۔

پا بہ گِل مانندِ شمشادش کند
دست و پا بندد کہ آزادش کند

وہ سرو کی طرح اسے پابہ گِل کر دیتی ہے تاکہ اس کی جڑیں زمین میں پیوست ہو جائیں اور اس کی شاخیں آسمان کو چھونے لگ جائیں۔ اسی کا نام حقیقی آزادی ہے۔

چوں اسیرِ حلقۂ آئیں شود
آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

جب فرد اس طرح آئین و قوانین کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کی قوتوں میں اس قدر ارتکاز (Crystallisation) پیدا ہو جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی ضرب ان میں ضعف و انتشار پیدا نہیں کر سکتی۔ اس طرح اس کی ذات میں پختگی آجاتی ہے۔ اور اس کی خودی مستحکم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جس طرح، جب ہرن کی ناف میں خون مجتمع ہو کر ارتکاز حاصل کر لیتا ہے تو وہ مشک میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

---x---

دوسرا بند ہے۔

تو خودی از بے خودی نشناختی
خویش را اندر گماں انداختی

انسانی زندگی کا مادی یا میکانکی تصور یہ ہے کہ زندگی سانس کی آمد و شد کا نام ہے۔ طبعی زندگی کے ختم ہو جانے سے انسان کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جسمِ انسانی میں کوئی شے ایسی نہیں جو موت کے بعد بھی باقی رہ سکے۔ زندگی کا یہ نظریہ یکسر غلط ہے۔ اس میں انسانی ذات کا تصور ہی نہیں آتا۔ اور جب ذات کا تصور ہی نہیں تو اس کے اثبات و نفی کی تمیز کا تصور کہاں سے آئے گا؟ پہلی چیز سمجھنے کی یہ ہے کہ

جوہرِ نوریست اندر خاکِ تو
یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو

انسان کے پیکرِ خاکی میں ایک شے ایسی بھی ہے جو مادہ کی پیداوار نہیں۔ وہ جوہرِ نور ہے۔ اسے خدا نے اپنی روح (ذرحتا) کہا ہے۔ یہی الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات یا نفس یا خودی کہتے ہیں۔ جسے انسانی عقل یا فکر و ادراک کہتے ہیں، وہ اسی ذات کی یک شعاع ہے۔

اس مقام پر اقبال نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انسانی ذات مادہ کی پیداوار نہیں، بلکہ انسانی فکر (Intellect) بھی مادہ کی تخلیق نہیں۔ یہ انسانی ذات ہی کا ایک پرتو ہے۔ قرآن اسی تصور کی تائید کرتا ہے۔ اس نے انسانی تخلیق کے سلسلہ میں "نفخِ روح" کے بعد کہا ہے وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۳۲/۹) لہٰذا نہ انسانی ذات مادہ کی تخلیق ہے نہ اس کا شعور و ادراک۔ اس کی زندگی اور اس کی کیفیات کا سارا انحصار اس کی ذات پر ہے۔

عیشت از عیشش، غمِ تو از غمش
زندہ از انقلابِ ہر دمش

اگر تیری ذات خوش و خرم ہے تو تو بھی فرحاں و شاداں ہے۔ اگر وہ افسردہ ہے تو تو بھی درحقیقت افسردہ ہے۔ تیری زندگی اسی کے دمبدم انقلاب کی رہینِ منت ہے۔ اگر وہ نامی اور متحرک نہیں تو تو مردہ ہے زندہ نہیں۔

واحد است و برنمی تابد دوئی
من ز تاب او من استم تو توئی

وہ اپنی ذات میں یگانہ (Unique) ہے اور کسی کو اپنے ساتھ شریک نہیں کر سکتی۔ وہ شرک کو برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ ہر ذات منفرد ہوتی ہے۔ کوئی دوسری ذات اس کی کیفیات و تجربات میں شریک نہیں ہو سکتی۔ میں اپنی ذات کی انفرادیت کی وجہ سے اپنی جداگانہ ہستی رکھتا ہوں۔ تو اپنی ذات کی یگانگی کی بنا پر اپنا الگ وجود رکھتا ہے۔ اگر ذات کی انفرادیت نہ ہو تو کسی فرد کی الگ ہستی ہی نہ ہو۔ میں اور تو کی تمیز اور احساس صرف انسان میں ہے۔ حیوانات اس سے آشنا نہیں۔ انسانی ذات کی کیفیت یہ ہے کہ

خویش دار و خویش باز و خویش ساز
نازہا می پرورد اندر نیاز

وہ بخود خریدہ ہے۔ اپنے آپ میں مستحکم ہے۔ اپنی نشو و نما میں کسی خارجی سہارے کی محتاج نہیں۔ اپنی قوت دروں سے اپنی نمود کا

سامان پیدا کرتی ہے۔ اس میں وہ کبھی خود اپنے آپ کی بازی لگا دیتی ہے اور فاتح و منصور باہر نکلتی ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ آئین و قوانین کی پابندی سے وہ کسی کی محکوم ہو رہی ہے۔ کسی کے سامنے جھک رہی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ آئین کی ان پابندیوں سے اپنی قوتوں میں اضافہ کر رہی ہوتی ہے۔

آتشے از سوز او گردد بلند
ایں شرر بر شعلہ انداز د کمند

وہ اپنے مقصد کے حصول میں تپاں تپاں آگے بڑھتی ہے جس سے سطحی نگاہوں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو جلا رہی ہے لیکن اس تگ و تاز اور سوز و گداز سے اس کی قوت و حرارت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسا اضافہ کہ اس سے یہ شرر (چنگاری) شعلہ پر کمند انداز ہو جاتا ہے۔ یعنی انسانی ذات (جو نچلے درجہ کی ہے) اسی تگ و تاز سے اتنی پختگی حاصل کر لیتی ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی کو (جو بلند ترین ذات ہے) اپنے آغوش میں لینے کی جرأت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے۔

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است
جزو او را قوتِ کل گیری است

ذات کی بنیادی خصوصیت آزادی ہے۔ لیکن وہ اپنی آزادی پر خود پابندیاں عائد کر لیتی ہے۔ اس سے اس میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ جزو، کل کو اپنے اندر جذب کر لینے کا حوصلہ کر لیتا ہے۔

اقبال نے یہاں 'جزو اور کل' کی اصطلاحات تصوف کی رعایت سے استعمال کی ہیں۔ اور وہ بھی یہ کہنے کے لئے کہ تصوف میں تو منتہائے زندگی یہ ہے کہ جزو اپنے کل میں جذب ہو جائے لیکن انسانی ذات میں اتنی صلاحیت ہے کہ یہ جزو اپنے کل کو اپنے آغوش میں لے لے۔ لیکن ہمیں یہ اصطلاحات اس انداز سے کبھی استعمال نہیں کرنی چاہئیں۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے (اور اقبال خود اسی کا قائل ہے) انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ ذات ایک غیر منقسم وحدت ہوتی ہے جو اجزاء میں تقسیم ہو ہی نہیں سکتی۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کی بنیاد ہی اس تصور پر ہے۔ اس لئے (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) اس مقام پر 'جزو اور کل' کی اصطلاحات کا استعمال محض تصوف کی رعایت سے کیا گیا ہے۔ (جو نہیں کرنا چاہیئے تھا)

خو گر پیکار پیہم دیدمش
ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

میں نے دیکھا ہے کہ یہ ذات ہمیشہ مصروفِ پیکار رہتی ہے۔ وہ تخریبی قوتوں کا مقابلہ کرتی رہتی ہے اور اس طرح اپنی ذات میں استحکام پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی وہ ذات ہے جسے میں کبھی خودی کے نام سے تعبیر کرتا ہوں۔ کبھی زندگی کہہ کر پکارتا ہوں۔

چوں ز خلوت خویش را بیروں دہد
پائے در ہنگامۂ جلوت نہد

وہ خلوت میں رہتی ہے تو اس کے جوہر مضمر اور خوابیدہ ہوتے ہیں جب بیدار ہوتی ہے تو ذوقِ نمود سے کائنات میں ہنگامہ خیز ہو جاتی ہے۔

نقش گیرِ اندرونش "او" می شود
"من" ز ہم می ریزد و "تو" می شود

چونکہ انسانی ذات "روحِ خداوندی" (الوہیاتی توانائی) پر مشتمل ہے اس لئے اس کے دل میں خدا کا نقش مرتسم ہو جاتا ہے۔ اسی سے انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی الگ ہستی کا اعتراف کیا جائے اور اسے تو کہہ کر پکارا جائے

جبر قطع اختیارش می کند
از محبت مایہ دارش می کند

وہ اپنے آپ پر پابندیاں عائد کر کے اپنے اختیار کو خود جبر میں بدل لیتی ہے۔ اور یہ سب اس لئے کہ آئین کی پابندیوں میں رہ کر دوسرے افراد سے محبت و مودت کے تعلقات پیدا کر سکے۔ سب سے پہلے یہ پابندی خود ذاتِ باری تعالیٰ نے اپنے اوپر عاید کی جب فرمایا کہ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (۶/۵۴) خدا نے کائنات کی نشوونما کا فریضہ اپنے اوپر عاید کر لیا ہے۔ اسی طرح انسانی ذات بھی دیگر افراد کی نشوونما کا فریضہ اپنے اوپر عاید کرتی ہے تو اس کی اپنی نمود اور نمو ہوتی ہے۔ اگر ذات اپنے آپ پر اس قسم کی پابندیاں عاید نہ کرے تو اس میں رافت و رحمت اور مودت کی صفات کی نمود نہ ہو۔

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز

اور یہ پیرِ جماعت کے اندر رہ کر ہی ممکن ہے۔

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

اس "خود شکنی" سے مقصود اپنی قوتوں میں ضعف اور اپنی جمعیت میں تشتت پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ اس سے خودی کے اختیارات کی وسعتیں حدود فراموش ہو جاتی ہیں۔

"نکتہ ہا چوں تیغِ پولاد است تیز
گر نمی فہمی ز پیشِ ما گریز"

انسانی ذات کے متعلق یہ نکات تلوار کی طرح تیز ہیں۔ انھیں اچھی طرح سمجھ لینے سے بات آگے چلے گی۔ اگر تو انھیں نہیں سمجھ سکتا تو پھر مجلسِ اقبال میں شریک نہ ہو۔

جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

نقد و نظر

(جماعتِ دینداران اپنے آئینہ میں)

۱۔ معراج المومنین
۲۔ روحِ اسلام

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں انجمن دینداران (حزب اللہ یا جمعیت مجاہدین فی سبیل اللہ) کے بانی چن بسویشور (صدیق) صاحب کی کتاب "مہرِ نبوت" کے اقتباسات سے بتایا جا چکا ہے کہ ان لوگوں کے عقائد کیا ہیں اور مشن کیا؟ انہی (صدیق صاحب) کی مزید دو کتابیں (جن کا نام اوپر درج ہے) اس وقت زیرِ تبصرہ ہیں۔ یہ کتابیں اس انجمن کی پاکستانی شاخ کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔

مرزا غلام احمد کی دعوت کی بنیاد اس عقیدہ پر تھی کہ اللہ تعالےٰ کی "صفتِ کلام" بدستور جاری ہے۔ اس لئے وہ اپنے خاص بندوں سے ہم کلام ہوتا ہے اور بشارات وغیرہ کے ذریعہ ان تک اپنا پیغام پہنچاتا ہے۔ یہی "مکالماتِ خداوندی" آگے چل کر وحی قرار پا گئے۔ اور اس طرح مرزا صاحب نے اپنے صاحبِ وحی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ صدیق صاحب، مرزا صاحب کے دعویٰ کی مخالفت کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بنیاد جس پر مرزا صاحب کے دعوے کی بنیاد استوار ہوئی تھی، اسے بدستور قائم رکھتے ہیں۔ چنانچہ روحِ اسلام کے مقدمہ صـ۱۶ پر ہمیں یہ عبارت

شرف ہم کلامی

ملتی ہے۔

اسی طرح آنحضرت ختمی مرتبتؐ پر وحی کا اختتام ہوا تو اہل اللہ پر مکالمہ الٰہیہ "بشارات" کا سلسلہ قائم ہوا۔

یہ ہے وہ (بظاہر معصوم سی) بنیاد جس پر صدیق صاحب کے دعویٰ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ پہلے یہ بتاتے ہیں کہ ان "اہل اللہ" کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور ان کا مقام کیا۔ اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ میں اسی مقام پر متمکن ہوں۔ اہل اللہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

(۱) اہل اللہ پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔ بشارت دیتے ہیں۔ اگر ان کے دل میں کوئی بات پیدا ہوتی ہے تو وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ ان کا ارادہ خدا کا ارادہ ہوتا ہے۔ ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ ان سے خدا کا مکالمہ مخاطبہ رہتا ہے۔ اہم معاملات میں قرآن اور حدیث پر غور کرنے کے بعد، خداوند کریم کے دربار میں مشورہ کرتے ہیں۔ وہ کلیم اپنے کلام کے ذریعہ مسئلہ کو حل کر دیتا ہے۔ (معراج المومنین صـ۳۲)

(۲) اہل اللہ "عرش رب العالمین" پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔ اس مقام پر عقلِ کل اور نفسِ کل کی حقیقت

اپنے اندر دیکھتا ہے۔ یعنی مقامِ احدیت میں بیٹھ کر وحدت اور واحدیت کی سیر کرتا ہے۔ جو شخص اپنی ذات کو الا صفات کے ہاتھ پر ہاتھ دیتا ہے دنیا کے مکار رندوں سے بچا۔ آئے دن وہ مرید اپنے اندر ایک سے ایک ہزاروں ہستیاں اپنے اندر دیکھتا ہے۔ (ایضاً صـ۳۳)

(۳) اس مقام والے شخص کی پہلی شناخت یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو..... ایسے انسان کا مل جانا گویا خدا کا مل جانا ہے (ایضاً صـ۳۴) اسے مامورِ وقت اور فنا فی الرسول کہا گیا ہے۔ (صـ۳۶)

(۴) وہ ذات اللہ میں فنا ہوتا ہے (صـ۳۱) یہاں وحدت بھی غائب ہو کر احدیت کے مقام پر عبد، معبود کہلاتا ہے۔ ایسی صورت میں اسکی ہر حرکت خدا کی حرکت ہو جاتی ہے۔ (صـ۳۹)

ایسے حضرات کے متعلق کہتے ہیں۔

(۱) ہمارا ایمان ایسا کامل ہے اور ہمارا مقام ایسا اعلیٰ ہے جس کے حصول کے لئے تمام انبیاء سابق نے دعا کی تھی۔ ہمارے مقام سے ان کو بہت کچھ ملتا ہے اور ان کے مقام سے ہم کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ (روحِ اسلام صـ۳۵)

(۲) اسی بات کا احساس انبیائے سابق کو تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس روح سے مستفیض ہونے کی دعائیں کیں۔ (صـ۴۳)

مرزا صاحب کے دعوے کی دوسری کڑی یہ تھی کہ وہ نبی اکرمؐ کی اتباع کامل سے انبیاء کے مقام تک پہنچ گئے۔ بلکہ ان سے بھی آگے نکل گئے۔ دیکھئے اس باب میں صدیق صاحب کیا فرماتے ہیں۔

انبیاء سے بلند درجہ

انبیاء سابق کا ظہور کثیر تعداد میں ایک کامل متبع حضورؐ سرورِ دو عالم میں ہوتا ہے۔ اس بات کا راز خدا تعالےٰ کی صفتِ کلیمی سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے خاص بندوں سے کلام کرتا ہے اور انبیائے سابق کے ناموں سے پکارتا ہے۔ اولیاء اللہ اپنی طاقتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک متبع حضور سرورِ دو عالم کبھی کسی نبی کے نام کو اپنے اوپر چسپاں کر کے فخر نہیں کرتا[1]۔ (معراج المومنین صـ۵۸-۵۷)

(۲) روحانیت کے مالک، حضرت سردارِ دو عالم اپنی قدسی طاقت سے روحانیت کی تمام خوبیوں کو جمع کر کے اپنے اندر سے اس آدمی کو ظاہر کرتے ہیں تاکہ بتوسط روحِ اعظم وہ انسان جس کی روح کی تڑپ اعلےٰ سے اعلیٰ مقام کی تھی کمال کو پہنچے۔ گذشتہ زمانے کے کل انبیاء کی ارواح جو اپنے کمالِ روحانیت میں ناقص ہیں وہ بہ حیثیت مجموعی ایک کامل متبع نبی اکرمؐ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ (معراج المومنین صـ۵۹)

---

[1] حالانکہ اور تو اور خود نبی اکرمؐ اپنے صاحبزادہ کا نام ابراہیم رکھتے ہیں ....، اور صدیق صاحب کے مرید اپنے آپ کو مثیل موسےٰ کہتے ہیں۔

مرزا صاحب کا دعوےٰ تھا کہ وہ "بروزِ محمد" ہیں۔ ہم "مہرِ نبوت" پر تبصرہ کرتے ہوئے (سابقہ اشاعت میں) بتا چکے ہیں کہ یہی دعوےٰ صدیق صاحب کا ہے۔ اسی بروزیت کی تشریح میں معراج المومنین کے پیش لفظ میں لکھا ہے

جس طرح جہاد مردوں پر فرض ہے، اسی طرح قرآن کریم ذات وحدت الوجود رحمت اللعالمین پر فرض ہے اسی حقیقت کے اظہار میں، اللہ تعالیٰ جب کبھی روح کے نزول کا ذکر کرتا ہے تو وحدت کا اظہار کرتا ہے۔ ایسے زمانہ میں حضور منبع انوار کا رہنا ضروری ہے تاکہ اپنا دربار گرم کریں۔ اس دربار مبارک کی شان بھی نزولِ قرآن سے ظاہر ہوتی ہے...... یہ عالمگیر جنگ اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ جب تک دوبارہ قرآن کریم کو لے کر حامل قرآن، ذات وحدت الوجود تشریف نہ لائیں، نہ قرآن آسان ہو سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کے فرقوں کا وجود مٹ سکتا ہے۔ (ص ۱۲-۱۳)

بُروزِ محمد

یہ "بروزِ محمد" صدیق دیندار چن بسویشور ہیں، جن کے متعلق (یعنی خود اپنے متعلق) وہ لکھتے ہیں۔

اب اے مسلمانو! تمہاری ہر حرکت میں روحِ اسلام کا ظہور ہونے کو تیار ہے۔ یہ حشر کا میدان ہے۔ محلوں کی مسجدوں اور عیدگاہوں کے اماموں کی اتباع وقتی تھی۔ اب مختلف امام میدانِ عرفات میں ایک امام کے پیچھے ہیں۔ ہر بات میں لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھو۔ بحمد اللہ صدیق کے دل کی تڑپ کا ایک ادنےٰ اظہار اتحاد المسلمین (حیدرآباد۔ دکن) کا قیام ہے۔ (روحِ اسلام۔ ص ۵۷)

باقی مسلمانوں کے متعلق ان کی حیثیت کیا ہے۔ اس کے متعلق کہتے ہیں۔

ایسا بندہ جو کام کرتا ہے وہ خدا کی مرضی سے کرتا ہے۔ عقلمند وہ انسان ہے جو ایسے انسان کی ہر بات میں اتباع کرتا ہے۔ ایسے بندہ کی غلطی بھی نیک پھل لاتی ہے۔ (معراج المومنین ص ۳۰)

مطاعِ کُل

(۲) جب کبھی مظہرِ خدا انسان آجائے ہر انسان کا کام ہے خواہ وہ کتنے ہی حلقوں میں بیعت کیا ہوا کیوں نہ ہو، فوراً اس کے پاس پہنچ جائے اور دریافت کرے کہ کیا اللہ کا کلام آپ سے جاری ہے۔ اور اللہ نے اپنے کلام سے آپ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ بتایا ہے۔ جب وہ ہمکلامی کا جز لکھ کر سامنے رکھے یا وہ آواز جو اس نے خود کے کانوں سے سنی ہے وہ جلد سنائے تو فوراً ہر انسان کا کام ہے کہ اس کے ہاتھ پر بیعت کرے۔ اس کا بیڑہ پار ہے اور اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم کے ماتحت ہر بات میں ایسے شخص کی اطاعت کرے خواہ وہ حکم اس کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ایسا انسان اپنی ہوا و حرص سے کوئی بات نہیں کرتا اور خدا کی مرضی کے ماتحت ہر بات اور ہر حرکت کرتا ہے۔ جو اس کا ہو گیا وہ خدا کا ہو گیا۔ دین و دنیا میں کامیاب ہے ایسے انسان سے ہر بات میں مشورہ کرے۔ بادشاہ کو بھی چاہیئے کہ وہ بغیر مشورہ ایسے انسان کے کوئی کام نہ کرے۔ اگر وہ خود شرفِ مکالمہ سے بہرہ ور ہے۔ اور اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بنا

ہے تو بادشاہ اپنی مرضی سے ہر کام کر سکتا ہے۔ ورنہ بادشاہ اور رعایا ایسے انسان کی ہر بات میں اطاعت کرے۔ دین و دنیا میں کامیاب ہوں گے۔ (معراج المومنین ص ۳۵)

یہی تھا وہ دعوےٰ جس کی بنا پر صدیق صاحب کہتے ہیں کہ

فقیر نے گاندھی جی اور محمد علی مرحوم سے کہا تھا کہ تم سب میری اطاعت کر لو۔ انشاءاللہ دس سال کے اندر سوراج دلاتا ہوں۔ باگل کوٹ کے بڑے عظیم الشان جلسہ میں کہا تھا کہ میری اطاعت میں سوراج ملنے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ میری مخالفت میں گورنمنٹ پر بلا پر بلا نازل ہوگی۔ جنگ میری مخالفت سے گورنمنٹ تباہ ہو جائے گی۔ (ص ۳۸-۴۰)

ہندوؤں کا چن بسویشور

مرزا صاحب کا یہ بھی دعوےٰ تھا کہ جس (کلنکی) اوتار کا انتظار ہندو کرتے ہیں، وہ وہی اوتار ہیں۔ وہ کرشن بھی ہیں۔ ایسا ہی دعوےٰ چن بسویشور صاحب کا بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

(دکن کے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں لکھا ہے کہ) ہمارا چن بسویشور (۲۷) جنم لیا۔ جنم مرن اس کو چکا نہیں، آئندہ وہ ۱۸۴۵ء شاہیان میں مسلمانوں میں ظاہر ہوگا۔ وہ اس کا آخری جنم ہے۔ گویا ان کے اوتار کو بھی نجات نہیں جب تک وہ مسلمان نہیں ہوا۔ چن بسویشور ہندوؤں کا مقدس سردار ہے۔ وہ صدیق کا ایک جسز و ہے۔ (روح اسلام ص ۹۷)

(۲) ہندوؤں کے پاس چن بسویشور مالک خزانہ الحق کا اس قدر انتظار ہے کہ کسی قوم میں حتیٰ کہ مسلمانوں میں بھی کسی وجود کا انتظار نہیں۔ وہ اپنے وقت پر آچکا ہے کہ صدیق چن بسویشور ان خزانوں کو نکالے (ص ۱۰۲)

یہ تو ہوئے خود بانی تحریک۔ اب ان کے متبعین کے متعلق سنئے۔ صدیق صاحب لکھتے ہیں۔

اسلام درحقیقت اپنے جلال و جمال کے انتہائی جوہر رکھتا ہے۔ روحانیت کا ادنےٰ کمال یہ ہے کہ غوث، قطب، ابدال، قطب الاقطاب پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں کہ جن کے مقام کی انبیاء نے آرزوئیں کی ہیں۔ (روح اسلام۔ ص ۱۲)

جماعت ابدال

اور ان کے متبعین کا خود اپنے متعلق یہ دعوےٰ ہے کہ

الحمد للہ ایسے فتنے کے زمانے میں اس کے علاج کے لئے حاشران اس کی غیرت سمندر سے یہ جماعت ابدال کھڑی ہوگئی۔ وہ اس زمانے کے رنگ کو بکلی بدلنا چاہتی ہے۔ (معراج المومنین، تعارف ص ۲۱)

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ہمارے واعظ جب غریب مسلمانوں کے اجتماع میں وعظ کہتے ہیں تو انہیں ان کی غریبی اور مفلسی پر قانع رہنے کے لئے ایک "حدیث" پڑھ کر سنایا کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ بدئی الاسلام غریباً وسیعود غریباً۔ اور اس کا ترجمہ کیا کرتے ہیں، اسلام شروع میں بھی غریبوں میں آیا اور دوبارہ بھی غریبوں ہی میں آئے گا۔ یعنی وہ عربی کے لفظ "غریب" کو اردو کے لفظ غریب (بمعنی مفلسی) کے معنوں میں لیتے ہیں۔ حالانکہ جو شخص تھوڑی سی عربی بھی جانتا ہے اسے علم ہے کہ عربی زبان میں "غَرِیبٌ" کے معنی مفلس نہیں۔ اس کے

غریب کے معنی معنی اجنبی اور مسافر کے ہیں اور جب اسے مجازی طور پر بولا جائے تو اس سے مراد عدیم النظیر، نادر اور یکتا کے ہوتے ہیں۔ صدیق صاحب (اور ان کی جماعت) نے اس "حدیث" کو متعدد بار پیش کیا ہے۔ اور اس سے استدلال کیا ہے کہ ہم غریبوں (مفلسوں) کی جماعت ہی وہ جماعت ہے جس میں احیائے اسلام کی بشارت رسول اللہ نے دی تھی۔ یعنی عربی زبان کے لفظ غریب کے معنی نہ صدیق صاحب کو معلوم ہیں۔ اور نہ ہی ان کی جماعت میں سے کسی کو۔ چنانچہ تحریر ہے۔

> اس جماعت کی چال ڈھال سے۔ اس کے قیل وقال سے۔ اس کے ظاہری حال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی انسانی دماغ کی پیداوار نہیں ہے۔ کیونکہ عدیم المثال سرمایہ داری کے زمانہ میں اس جماعت کا ہر فرد تارک الدنیا نظر آتا ہے۔ نہ اس کے پاس کھانے کے لئے کھانا ہے اور نہ پہننے کے لئے کپڑوں کے جوڑے کھانے سے بے غم۔ ایک جوتے، ہیں جوئیں مارتا ہوا۔ جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرتا ہوا وہ خوش ہے اس بات سے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے لئے اس کو انتخاب کیا ہے چونکہ قرآن نے اپنے عمل میں آنے کے لئے غریبوں کے وجود کا وعدہ کیا تھا اس وجہ سے وہ غریبوں میں نظر آرہا ہے۔ مخبر صادقؐ نے خبر دی تھی بدءُ الاسلام غریباً سیعود غریباً۔ لہٰذا اس پیشگوئی کو پورا کرنے کے لئے قرآن غریبوں میں عود کیا ہے۔ غریب لوگ کون ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں جن کو قرآن نے قرن اولیٰ میں اپنا عملی جامہ پہنایا تھا۔ جن کا لباس فقیرانہ ہے۔ بال بکھرے ہوئے۔ بازاروں میں جوتے چٹخاتے پھرتے ہیں۔ جھگیوں میں رہتے ہیں۔ ظاہری علم سے بے بہرہ۔ نہ ان کے پاس تفسیروں کا خزانہ ہے۔ نہ فقہ واحادیث کا ذخیرہ۔ غرض لفظ غریب کی بشارت ہر حالت سے پوری ہوتی ہے (معراج المومنین صفحہ ۲۴، ۲۱)۔۔۔۔ اللہ والے کے پاس دنیاداری نہیں آتی۔ (صفحہ ۲۷)

"ظاہری علم سے بے بہرہ" ہونے کے سلسلہ میں خود صدیق صاحب نے اپنے متعلق لکھا ہے کہ

> معلوم ہوتا ہے کہ مامور وقت۔ فنافی الرسول انسان ظاہری علوم میں مشہور ومعروف نہیں ہوتا (صفحہ ۳۶)

اگرچہ وہ "مہر نبوت" میں خود ہی لکھ چکے ہیں کہ

> اس دوران میں میں نے مختلف علوم پڑھے۔ علوم ظاہری میں کمال حاصل کرنے کے لئے انگریزی کی تعلیم پائی۔ (صفحہ ۲۷)

تضادات لیکن اس قسم کے تضادات، ان عالم بالا سے متعلق حضرات کے لئے معاف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب کی تصانیف بھی تضادات سے بھری پڑی ہیں اور صدیق صاحب (اور ان کے متبعین) کے ہاں بھی ان کی کمی نہیں مثلاً انہوں نے اوپر لکھا ہے کہ مفلسی اور ناداری خدا کی رحمت ہے۔ وہ قرآن کی عملی تشکیل اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مفلسوں ہی کی جماعت کو منتخب کرتا ہے جو اس کے لئے جہاد وقتال کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

> حضرت رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کمان اپنے گھر میں رکھتا یا بند رکھتا ہے تو اللہ سبحانہ اس کے

پاس سے چالیس سال تک افلاس کو دور کر دیتا ہے۔ (روح اسلام ص ۸۳)

یا مثلاً معراج المومنین میں لکھا ہے کہ

فرقہ اور جہاد دو متضاد چیزیں ہیں۔ سید احمد بریلویؒ نے ایک فرقہ بنایا[1]۔ اس وجہ سے وہ حقیقی معنوں میں جہاد نہیں کر سکے۔ (ص ۳۰)

لیکن روح اسلام میں انہی سید صاحب کے متعلق ہے۔

انشاء اللہ کفرستان بھارت دیکھے گا کہ مجاہدین اسلام حضرت سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا وہ مشن جس کے احیاء کے لئے اس بزرگؒ (یعنی صدیق صاحب) اور ان کے رفقاء نے یہ سارے دکھ سہے۔ عنقریب بار آور ہو کر رہے گا۔ (ص ۳۹ مقدمہ)

فرقہ بندی کی بات سامنے آئی تو اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں کہ

مخبر صادقؐ نے خود خبر دی تھی کہ میری امت میں (۷۳) فرقے ہوں گے۔ وہ بحمداللہ پورے ہوئے۔ (روح اسلام ص ۸۶)

اس بحمداللہ پر غور کیجئے! حالانکہ خود ہی لکھتے ہیں کہ

اسلام دنیا کی اقوام کی تفرقہ بازی کو مٹانے آیا تھا۔ جب تک وہ فرقہ بندیوں سے الگ تھا اقوام عالم کا سردار تھا۔ اور جب اس میں خود فرقے ہو گئے۔ وہ روح باقی نہ رہی۔ (ص ۸۷)

آخر میں دو ایک نمونے ان کے قرآنی اور دینی علم کے بھی دیکھتے جایئے۔ قرن اول کے حقیقی اسلام کے متعلق لکھتے ہیں۔

(ان حضرات نے) قیصر و کسریٰ جیسے جلیل القدر صاحب سطوت اور پُر شوکت بادشاہوں کے سامنے جا کر کہا کہ اسلام قبول کرو۔ ورنہ اپنے بیوی بچوں کو۔ دولت و عورت کو۔ ہمارے حوالے کر کے غلام بن کر رہو..... چنانچہ اس شہنشاہ کی لڑکی جب دربار میں لائی گئی حضرت عمرؓ نے کہا کہ لونڈیوں کے گلے میں زیور نہیں ہوا کرتا۔ اس کا زیور اتار لو۔ اللہ اللہ۔ وہ دماغ اب مسلمانوں میں کہاں جو اپنے زمانے کی شاہنشاہوں کی لڑکیوں کو باندیاں سمجھیں اور لڑکوں کو غلام۔ اور وہ مٹھی بھر مسلمان اپنے دشمنوں کی خوبصورت عورتوں اور دوستوں کو ریگستان میں بیٹھے ہوئے تقسیم کر لیتے ہیں۔ (روح اسلام۔ ص ۷)

اس کا فلسفہ بھی سن لیجئے۔

---

[1] یہ بیان واقعہ کے خلاف ہے۔ سید احمد بریلویؒ نے کوئی فرقہ نہیں بنایا تھا۔

کافروں کی چیخ پکار کی پرواہ مت کرو۔ مالِ غنیمت حلال ہے۔ قبضہ کرو۔ بعد ۂ وہ خود سمجھ جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مالِ غنیمت میں مرد جب غلام ہو کر آتا ہے تو وہ اپنی غلامی کو محسوس کر کے اسلام قبول کرے گا۔ اسی طرح اس کا ارتقا ہو جاتا ہے۔ اور ایک عورت غیر کی منکوحہ جہاد میں ملتی ہے تو ہمارے لئے حلال ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ کفر کے زمانے میں غلام بچے پیدا کرتی ہے۔ اب سردار پیدا ہو رہے ہیں۔ سرداروں کی ماں بنتی ہے۔ چھوٹے غم و غصہ کو بھول جاتی ہے۔ اس طرح اس عورت کا ارتقا ہو جاتا ہے　　(؍ صفحہ ۹۶)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

عورت

ایک دن (دربارِ رسول اللہ میں) ایک صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ۔ جب تمام دنیا ہماری ملک ہے اور جہاد میں دنیا کی عورتوں کا نکاح ہے تو ایران کی عورتیں جو بہت خوبصورت ہیں وہ بھی ہماری ملک ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یا رسول اللہ میں نے ایک عورت کو نظر میں رکھا ہے۔ بڑی خوبصورت ہے جس کو میں نے شام کی تجارت کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ حضورؐ مجھے وہ عورت دیدینا۔ اس پر حضور سرورِ دو عالمؐ نے فرمایا۔ تمہیں ہی دوں گا۔ واقعی جب ملکِ ایران فتح ہوا اور وہ عورت صحابی مذکورؓ کے حوالے کی گئی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک عرب بادیہ نشین کے حوالے ایران کی مشہور بالدار حسینہ ہو جائے گی۔　　(صفحہ ۱۰۳)

خدا کی شان ہے پہلے دور میں دو "ملہم ربانی" پیدا ہوئے۔ ایک کو خدا نے بتایا کہ جہاد بالسیف، ہر حال میں حرام ہے۔ اور دوسرے سے کہا جہاد دوسروں کو لوٹنے کا نام ہے ـــــ دولت اور عورت سب کچھ لوٹنے کا نام ـــ اور مومنین پر یہی جہاد فرض ہے! عورتوں کے سلسلہ میں تو صدیق صاحب نے ایک 'حدیث' بھی نقل کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

حضرت معقل بن یسارؓ نے فرمایا کہ حضرت رسول اللہ کو گھوڑے سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ تھی پھر فرمایا الٰہی بخشش دنیا۔ مگر عورتیں: یعنی عورتیں (رسول اللہ کو) سب سے زیادہ محبوب تھیں اور ان کے بعد گھوڑا۔　　(صفحہ ۵)

(۲) علم کی دوسری مثال 'معراج میں حضورؐ کی سواری (براق) کے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں۔

براق

حضرت صالحؑ کی سواری اونٹنی تھی اور یہ معراج میں ان کی سواری تھی۔ حضرت سلیمانؑ کی سواری گھوڑا تھا اور یہ معراج میں ان کی سواری تھی۔ سری کرشن جی کی سواری گرڑ تھا اور یہی ان کی معراج کی سواری تھی۔ برہمنی کی سواری مور تھا اور یہی ان کی معراج کی سواری تھا۔ شیوا کی سواری بیل تھا اور یہی ان کی معراج کی سواری تھی۔ حضرت علیؓ کی سواری شیر تھا اور مشہور ہے کہ بعض اولیاء اللہ کی سواری بھی شیر تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی سواری گدھا تھا اور یہی ان کی معراج کی سواری تھا۔ وشوا کرم کی سواری شکتی (عورت) تھی اور یہی ان کی معراج کی سواری ہے۔ ان تمام کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو براق بنتی ہے۔ اس جانور میں تمام کائنات کے

جانور نظر آتے ہیں...... اس کا نام اسلام نے براق دیا ہے۔ یہ حضرت سردار دو عالم کی معراج میں سواری تھی۔ ہندوؤں کی کتب میں اس کا پورا نقشہ دیا ہے۔ دو ہزار سال پیشتر اوراکے غاروں میں سے نمبر ۱۶ رنگ محل میں اس کی مورت موجود ہے۔ اس سواری میں صالح کی اونٹنی کی گردن ہے۔ سلیمان کے گھوڑے کے پاؤں ہیں سری کرشن جی کے گرڑ کے پنکھ ہیں۔ سرسوتی کی سواری مور کی دم ہے۔ شوا کی سواری بیل کا دھڑ ہے۔ حضرت علیؓ کی سواری شیر کا چھاتہ ہے۔ حضرت عیسیٰ کے گدھے کے ایال ہیں۔ وشو اکرم کی سواری عورت کی صورت ہے۔[1] (ص ۷۶-۷۷)

اس سواری پر جب حضورؐ معراج میں تشریف لے گئے تو

ساتویں آسمان میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آواز آئی۔ علیؓ کا ہاتھ آیا۔ اس کی بشارت یہ ہے کہ انتہا میں صدیق صفت والے حضورؐ کا احسان دنیا کے سامنے رکھ کر دنیا کی ہر حجت پوری کر دیں گے۔ حضرت علیؓ اسد اللہ الغالب۔ شیر یزداں۔ شاہ مرداں قوت پروردگار کا ہاتھ قوت سے کام کرے گا۔ (ص ۷)

حضرت "صدیق اور علیؓ" کا مجموعہ اس لئے کہ صدیق صاحب "سید السادات الحسینی" ہیں اور نام ان کا "صدیق حسین" ہے۔ یعنی قادیانی صاحب چونکہ ذات کے مرزا تھے اس لئے انہیں بتایا گیا کہ آخری زمانے میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ حضرت سلمان فارسیؓ کی اولاد کے ہاتھوں سے ہوگی۔ اور دکنی صاحب چونکہ سید تھے اور نام صدیق، اس لئے ان سے کہا گیا کہ آخری دور میں صفت صدیقی اور اسد اللہی کے حامل اسلام کی حیات نو کے ضامن ہوں گے۔

بہرحال یہ ہے اس جماعت دینداران اور ان کے بانی کے عقائد و تصورات کا مرقع جو ان کی پیش کردہ دو کتابوں سے مرتب ہوتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان شطحیات کے متعلق یہ بتانا کہ یہ کس طرح قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف اور علم و عقل کی نقیض ہیں، قارئین طلوع اسلام کے فہم و بصیرت کی تحقیر (INSULT) ہوگا۔ یہ ہے وہ جماعت جو احیائے اسلام کے لئے پاکستان میں جہاد کے لئے آئی ہے اور جن کا دعوے ہے کہ ان کا کوئی عقیدہ مسلمانوں کے عقائد سے مختلف نہیں اور طلوع اسلام نے بلاتحقیق ان کے خلاف لکھ دیا ہے۔

مذہبی مراق

مرزا صاحب کے متعلق امرتسر کے ایک طبیب، حکیم محمد علی صاحب نے خالص طبی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ کے بعد یہ ثابت کیا تھا کہ انہیں مراق[2] کا مرض تھا۔ جو اقتباسات سابقہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذرے ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ صدیق صاحب کے دماغ میں بھی کوئی خرابی تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ "دیوانہ بکارِ خویش ہشیار" تو اس قسم کے مذہبی مراق والوں کی تکنیک بڑی دلچسپ اور ابلہ

---

[1] کتاب میں دیندار صاحب نے براق کی تصویر بھی دی ہے اور اس کے ساتھ دیگر "صاحبانِ معراج" کی سواریوں کی تصاویر بھی۔

[2] یہ ایک بیماری کا نام ہے جسے انگریزی میں (Paranoia) کہتے ہیں۔

قریب ہوتی ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ذرا سوچئے کہ خدا کی اور صفات تو ازلی اور ابدی ہوں لیکن اس کی صفت کلیمی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے؟ خدا (معاذ اللہ) گونگا نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے بندوں سے ہمیشہ کلام کرتا رہے گا۔ یہ مکالمہ اولیاء اللہ سے ہوتا ہے۔ پھر وہ کہیں گے کہ دیکھئے۔ حضرت موسیٰ کی امت میں تو اس قدر انبیاء کرام آئے۔ لیکن کیا امت محمدیہ ایسی عقیم (بانجھ) ہے کہ اس میں کوئی نبی بھی نہیں آسکتا! یہ تو حضورؐ کی شان کے منافی ہے۔ حضور سید المرسلین ہیں۔ آپ کی اتباع کامل میں ایسا روحانی اثر ضرور ہونا چاہیئے کہ اس سے حضورؐ کے غلام انبیائے بنی اسرائیل کے مثل ہو جائیں۔ پھر وہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جب معاشرہ میں فساد عام ہو جائے اور اصلاحِ حال کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو وہ اپنے بندوں میں سے کسی کو اس مقصد عظیم کے لئے کھڑا کر دیتا ہے۔ یہی سنت اللہ اب بھی جاری ہے۔ لیکن اب اس قسم کے مصلحین صرف بتوسطِ نبی اکرمؐ آسکتے ہیں براہ راست پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ جو کچھ ان بندگانِ خدا کے ہاتھوں سے سرزد ہوتا ہے وہ مشکوٰۃِ محمدیؐ ہی کا نور اور قوت خداوندی ہی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ اللہ کے مظہر اور حضورؐ کے بروز ہوتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ذاتی ہستی کچھ نہیں ہوتی۔ سب خدا اور اس کے رسول کا پرتو ہوتا ہے۔

ابلہ فریبی

آپ نے دیکھا کہ ان نظریات میں مسلمانوں کے نرم و نازک جذبات سے کس قدر اپیل کی گئی ہے۔ ایسی اپیل کہ سادہ لوح مسلمان جھٹ اس کے دامِ تزویر میں آ جائے۔ جب وہ ان مبادیات کو مان لے تو اس کے بعد اگلا قدم بڑھایا جاتا ہے کہ بتلایئے کہ اس دور میں اس قسم کی دینی خدمات (مرزا صاحب یا صدیق صاحب وغیرہ کے سوا) کس نے انجام دی ہیں؟ یہ ہے وہ ابلہ فریب تکنیک جس سے یہ حضرات ان سادہ لوح مسلمانوں سے اپنے دعاوی منوا لیتے ہیں جنہیں نہ تو قرآن پر عبور ہوتا ہے اور نہ ہی ان کا ذہن آنا پختہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے منطقی مغالطوں کا رد سوچ سکے۔ دیندار انجمن والوں نے اس کے ساتھ اپنی وضع قطع بھی ایسی بنا رکھی ہے جن سے عوام خواہ مخواہ متاثر ہو جائیں۔

ختم نبوت کے معنی

پاکستان میں مرزا صاحب کے متبعین کی طرح چن بسویشور والوں کو بھی طلوع اسلام اپنا سب سے بڑا حریف نظر آتا ہے اس لئے کہ اس نے اس غیر قرآنی بنیاد ہی کو سرے سے اکھیڑ دیا ہے جس پر یہ حضرات اپنے دعاوی کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) ان کے دعاوی کی بنیادی اینٹ یہ ہوتی ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی طرف سے الہامات اور مکاشفات ہوتے ہیں طلوع اسلام نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ قرآن کی رو سے یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ ختم نبوت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اب کوئی شخص براہِ راست خدا سے علم حاصل نہیں کر سکتا۔ علمِ خداوندی اب قرآن کے اندر ہے۔ اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ یہ ہے قرآن کا وہ ثعبان مبین جس کے سامنے ساحروں کی رسیاں ٹھہر ہی نہیں سکتیں۔ چنانچہ یہی وہ خدشہ تھا جس کے پیشِ نظر دیندار انجمن نے طلوع اسلام کی تنقیدات کی پہلے ہی پیش بندی کر لی، اور اس میں ہر وہ حربہ استعمال کیا جو قرآن سے گھبرانے والے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ معراج المومنین کے پیش لفظ میں (جو قریب دو سال اُدھر لکھا گیا تھا) ہمیں یہ عبارت ملتی ہے۔

ایک بہت بڑا طبقہ سنت کو عمل ہیں نہ پاکر حدیث سے کٹتا ہوا صرف قرآن کریم پر اسلام کا حصر کرنا چاہتا ہے اور قرآن فہمی کے لئے مغربی زاویۂ نظر استعمال کرتا ہوا اجنبیات واقتدارات ہی کی آگ میں کہیں تعدد ازدواج۔ کہیں وراثت۔ کہیں قتل مرتد اور غلاموں اور لونڈیوں کے مسائل سے بحث کرتا ہے تاکہ عالم اسلام کو روحانی عالم سے برگشتہ کردے۔ (ص ۱۳)

آپ نے غور کیا کہ ان حضرات نے اپنی حفاظت کے لئے کون سے دو قلعے تعمیر کئے ہیں (اگرچہ یہ قلعے محض گتے کے ہیں) ایک تو یہ کہ اسلام صرف قرآن کریم میں محصور نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اصل اسلام "روحانیت" ہے۔ اگر آپ اسلام کو قرآن میں محصور کرلیں تو اس قسم کے غیر اسلامی عقائد و تصورات کے لئے (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کوئی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی۔ ان کی گنجائش نکلتی ہے

روایات

ان وضعی روایات سے جن کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ مرزا صاحب کے تمام دعاوی کا مدار اسی قسم کی روایات پر تھا۔ بعینہٖ یہی حالت دیندار صاحب کی ہے۔ ان کی کتابوں میں بھی ہر رطب و یابس کی تائید میں کوئی نہ کوئی روایت دیدی گئی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یہ کہے کہ "رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ....." تو اس کی تردید کرنے والے کے متعلق فوراً کہا جائے گا کہ لیجئے! یہ شخص ارشادِ نبویؐ کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ ہے ان کی پہلی پناہ گاہ۔ یعنی وضعی روایات کا سہارا۔

روحانیت

ان کا دوسرا قلعہ "روحانیت" ہے اور یہ قلعہ عوام فریبی کے لئے روایات سے بھی زیادہ مضبوط اور وسیع ہوتا ہے۔ آپ

(۱) وحی کے دروازوں کو چوپٹ کھلا رکھیے۔

(۲) دربارِ خداوندی میں براہِ راست مشوروں کا دعوےٰ کیجئے۔

(۳) اپنے ہر فیصلہ کو خدا اور رسول کا فیصلہ قرار دیجئے۔

(۴) عرشِ الٰہی پر جلوہ افروز ہوجایئے۔

(۵) عبد کو معبود بنا ڈالئے۔

(۶) اپنے آپ کو خدا کا مظہر اور رسول کا بروز ٹھہرا لیجئے۔

(۷) انبیاء کرام کی روح کو ناقص قرار دے کر انھیں اپنے دربار میں طلب کیجئے۔

(۸) قرآنی الفاظ کو باطنی معانی پہنا دیجئے۔

(۹) ہندوؤں کے اوتار بنئے۔ مجوسیوں کے مظاہر کی طرح قضا و قدر کے مالک بن جایئے۔ خدائی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لیجئے اور

(۱۰) بھنگڑ خانے کے سرمستوں کی طرح جو منہ میں آئے بکتے چلے جایئے۔

اگر آپ نے انھیں روحانیت کا مقدس لبادہ اڑھا دیا۔ تو یہ سب کچھ عین اسلام' بلکہ مغزِ اسلام قرار پاجائے گا جس کے لئے کسی سند اور دلیل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور اس سے انکار کرنے والے پر دنیا اور عاقبت دونوں میں لعنت برسے گی۔

سوچئے کہ کیا وسیع ہے یہ قلعہ اور کس قدر "محکم" ہیں اسکی دیواریں! یہی ہیں وہ قلعے جن میں مجوسیت، مانویت، یہودیت، عیسائیت باطنیت وغیرہ اسلامی نقاب اوڑھے بیٹھی ہیں۔ اور یہ غل وغش اللہ والوں کی متاعِ دین و دانش لوٹتی چلی جاتی ہیں۔ بہائیت، مرزائیت دینداریت وغیرہ قسم کی تحریکیں انہی کے مختلف بہروپ ہیں اور صرف اسلئے کہ

مسلمانوں کے ہاتھ میں قرآن کریم ہے۔ لیکن ان میں اس کی روح کی بو باس نہیں۔　　(روحِ اسلام۔ ص۔)

یاد رکھئے! جب تک دین کے ہر معاملہ کا آخری اور حتمی معیار قرآن کریم کو قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس قسم کی اسلام سوز تحریکیں کبھی ختم نہیں ہونگی۔

۳۔ "ایک اور نبی"

اتفاق کی بات ہے کہ انہی دنوں ہمیں لاہور سے "ایک اور نبی" کا خط موصول ہوا ہے جس نے بڑے زور شور سے کہا ہے کہ

اے باشندگان پاکستان۔ میری رسالت منجانب اللہ پر۔ تصدیق دل ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ کے اُن احکام کی تعمیل کرو جو وہ اب میرے ذریعے تمام انسانوں کے لئے صادر فرماتا ہے۔

انھوں نے اپنا نام نامی اور اسم گرامی لکھا ہے۔ ضمیر حسین قریشی۔ سابق وکیل۔ ساکن کنال پارک لاہور۔ مرزا صاحب اور صدیق صاحب کی طرح انھیں بھی الہام نظم میں ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ایک طویل الہامی نظم بھی ہمیں بھیجی ہے۔ چند ایک اشعار ملاحظہ ہوں فرماتے ہیں۔

کہا خدا نے یہ حکم خدا ندا کر دے　　ہر ایک کو مطلع تو خود کے ماسوا کر دے

میں ہوں خلیفہ اللہ در جہاں والہٰ　　بہ دینِ حق کہا اللہ نے ندا کر دے

ہر اک شریعتِ ماقبل کا ہوں میں ناسخ　　بہ حکم عادل، اللہ تو یہ ندا کر دے

بہ دین حق ہوں میں امروز نایب اللہ　　بحکم من اللہ ان یہ ندا کر دے

یہ ہے نمونہ اُس الہامی نظم کا جس کے متعلق ارشاد ہے کہ

ہر ایک لفظ ہے اِس نظم کا کلامِ خدا　　کہا خدا نے یہ حکم خدا ندا کر دے

بتصدیق دل ہو جو مومن بایں کلام خدا　　وہ ہی ہے مومن صادق تو یہ ندا کر دے

سوائے اسکے ہر ایک شخص یا تو ہے بے دین　　یا کافرِ ابدی ہے تو یہ ندا کر دے

آپ اس پر ہنسئے۔ لیکن "روحانیت" کے معتقدین سے پوچھئے تو وہ کہدیں گے کہ یہ سب، عالمِ بالا کی باتیں ہیں جو الہامی زبان میں بیان کی گئی ہیں۔ تم ناسوتی اِن رازوں کو کیا جانو؟

کشمیر اور ہندوستانی مسلمان

(مولانا احمد سعید۔ نائب صدر جمعیۃ علمائے ہند)

[پاکستان کی تحریک کو اتنا نقصان ہندو اور انگریز نے نہیں پہنچایا تھا جتنا نقصان نیشنلسٹ مسلمانوں نے پہنچایا تھا اور ایک پاکستان کی تحریک پر ہی کیا موقوف ہے مسلمانوں کی ساری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ انہیں غیروں سے کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا خود اپنوں کے ہاتھوں سے پہنچا ہے۔ یہ نیشنلسٹ مسلمان مختلف طبقات پر مشتمل تھے ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو مسلمان گھرانوں میں تو پیدا ہو گئے تھے لیکن جنہیں اسلام (بلکہ کسی مذہب) سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دلچسپی ہی نہیں۔ وہ مذہب کو انسانی ترقی کا دشمن سمجھتے تھے۔ دوسرا گروہ ان مذہب پرستوں کا تھا جو مذہب کا دائرہ صرف "خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق" تک سمجھتا تھا۔ اس لئے ان کا عقیدہ تھا کہ حکومت کسی قسم کی بھی ہو اگر اس میں مسلمانوں کو نماز روزے کی آزادی حاصل ہو تو اس میں مسلمان مسلمان کی حیثیت سے خوش و خرم رہ سکتا ہے۔ تیسرا گروہ ان "مقدسین" کا تھا جن کی زبان پر اسلام تو تھا لیکن وہ دل میں اسلام کے مستقبل (مسلمانوں کے مستقبل نہیں بلکہ اسلام کے مستقبل) سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ ایک ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتے تھے جو ہر ہمہ سماجی قسم کے مذہب کے لئے سازگار ہو۔ چوتھا گروہ وہ تھا جو پاکستان کی محض اس لئے مخالفت کرتا تھا کہ اس سے ان کی "مہتر داری" (لیڈری) میں فرق آتا تھا۔ یہ گروہ (محض ذاتی عناد کی بنا پر) مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں سب سے آگے تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ تو پاکستان آ گئے (اور یہاں آ کر پاکستان کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے درپے ہو گئے اور اب تک ہیں) اور باقی ہندوستان میں اس کے درپے تخریب ہیں۔ ان لوگوں کے دل میں مخالفت کی آگ کس حد تک شعلہ ریز ہے اس کا کچھ اندازہ ذیل کے مقالے سے لگ سکے گا جو مدینہ (بجنور) کی ۵ جولائی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جس شخص کے دل میں اسلام کا ذرا سا بھی احترام اور مسلمانوں کے لئے جذبۂ ہمدردی کی کوئی رمق بھی ہو وہ (خواہ کیسے ہی نامساعد ماحول میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کیوں نہ ہو) اس قسم کے زہریلے خیالات کو اپنے دل میں کبھی نہیں آنے دے گا۔ لیجئے اس مضمون کو ہماری طرح اپنے سینے پر پتھر رکھ کر پڑھیئے۔ طلوع اسلام]

کشمیر کے متعلق پاکستان کا پروپیگنڈہ روز بروز زہریلا بنتا جا رہا ہے۔ ایک تو کشمیر کے متعلق غلط اور بے بنیاد خبریں پھیلائی جا رہی ہیں۔ اور دوسرے تقریباً ہر روز پاکستان کا کوئی نہ کوئی لیڈر یا اخبار ہندوستان کے خلاف جہاد کا مطالبہ کرتا ہے۔ حکومت ہند اس دروغ گوئی کا نوٹس نہ لینے یا اس کا جواب نہ دینے میں حق بجانب ہے۔ کشمیر کے اردگرد کوئی آہنی دیوار نہیں لگی ہوئی ہے اور وہاں کے حالات کا ہر کس و ناکس پوری طرح سے جائزہ لے سکتا ہے۔ لیکن ہر غیر ملکی یا ہندوستانی تو کشمیر جاتا نہیں اور ایسے ہی لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے پاکستان کی طرف سے غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔

ہماری حکومت کے ہاتھ اخلاقی زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق عوام اپنے احساسات اور امنگوں کو حتی الامکان تک شد و مد کے ساتھ پیش کرنے سے باز رہیں اور دنیا کے تمام حصوں میں جو لوگ پاکستانی پروپیگنڈے کے شکار ہوئے ہیں ان کو ہمیں یہ بتانا ہے کہ ہم میں اپنی اس اہم سرحدی ریاست کے لوگوں کو مزید کسی حملہ سے بچانے کے لئے مشترکہ اور آہنی ارادہ موجود ہے اور ہم اس ریاست کے ان حصوں کو جلد از جلد آزاد کرانے کے لئے مضطرب ہیں جن پر کہ اس وقت پاکستان کا قبضہ ہے۔

مسلمانوں کا فریضہ

اس سلسلہ میں ساڑھے چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کو اہم پارٹ ادا کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو پھر وہ ان تمام اصولوں سے غداری کریں گے جن کی وہ عمر بھر پیروی کرتے رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کشمیر میں پاکستانی پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ لیکن ملک کے باقی حصوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مسئلہ کشمیر کے متعلق خاموش رہنے کا یہ ردعمل ہوا ہے کہ کچھ حلقوں میں یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کا نظریہ مختلف ہے جو کہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اور اس غلط فہمی کو جلد از جلد دور کیا جانا چاہیئے۔ ہندوستان کے تمام ذی فہم اور بالغ النظر مسلمانوں کی یہ قطعی رائے ہے کہ کشمیر کے عوام صرف آزاد ہندوستان کے باشندوں کی حیثیت سے ہی ترقی کر سکتے اور خوش حال بن سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے اپنی اس رائے کو ابھی تک ببانگ دہل ظاہر نہیں کیا ہے۔ میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ ان کا یہ احساس تھا کہ کشمیر کا مسئلہ ایک آئینی اور قانونی مسئلہ ہے اس کے علاوہ انصاف ہندوستان کے حق میں ہے لہذا ہندوستانی مسلمانوں میں رائے عامہ کو اس سلسلہ میں منظم کرنے کی ضرورت نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس طریقہ سے اب سوچنا ٹھیک نہیں۔

جب بھی پاکستان نے انجمن اقوام متحدہ کی طرف مسئلہ کشمیر کے بارے میں رجوع کیا جب بھی انجمن اقوام متحدہ کا نمائندہ اس برصغیر میں مسئلہ کشمیر کا جائزہ لینے کے لئے آیا۔ پاکستان کو چھوٹی یا بڑی شکست ہوتی رہی۔ پاکستان کو اس سلسلہ میں جو تازہ شکست ملی ہے وہ سویڈن کے سر جارنگ کے مشن اور ان کی رپورٹ ہے۔ اس بات کے باوجود کہ سامراجی ممالک میں پاکستان کے بہت سے سرپرست موجود ہیں انجمن اقوام متحدہ کے اکثر و بیشتر فیصلے پاکستان کے حکمرانوں کے لئے کافی مایوس کن ثابت ہوئے ہیں اور اس طرح سے ہندوستان میں اطمینان کی فضا پیدا کرنے میں مدد ملی ہے۔ پھر بھی ہندوستانیوں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ پاکستان کے حکمراں کبھی بھی حق اور انصاف پر ایمان نہیں لائے اور انھوں نے ہمیشہ انجمن اقوام متحدہ کی آڑ میں ہندوستان کے خلاف خطرناک سازشیں کرنے کی کوشش کی ہے۔

دو حقائق

اس کا اندازہ اس پروپیگنڈے سے کیا جا سکتا ہے جو پاکستان کے حکمراں اپنے ملک میں اور بیرونی ممالک میں کرتے

ہیں۔ بیرونی ممالک میں پاکستانی حکمراں پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ ان کے ملک کو ہندوستان کی طرف سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے اور اس سلسلہ میں حکومت پاکستان امریکہ اور برطانیہ سے امداد بھی طلب کرتی ہے۔ دوسری طرف سے وہ پاکستانی پریس کے ذریعے عوام کو ہند کے خلاف لڑنے کے لئے ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا کہ کراچی کے ایک اخبار نے جس کا دعوےٰ یہ ہے کہ اس کے بانی محمد علی جناح مرحوم ہیں اپنے حالیہ افتتاحیہ میں لکھا کہ "ہندوستان کو ہم سے جیسا شدید دشمن اور کہیں نہیں ملے گا اور پنڈت نہرو کے بعد ہندوستان میں جو انارکی پھیلے گی اس کا اگر ہم فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں تو یہ ہماری انتہائی بیوقوفی ہوگی اور اس درمیانی عرصے میں ہم انشاء اللہ ہندوستان کے خلاف کارروائی کرنے میں کسی بھی حد تک جائیں گے۔" پاکستان کے جذباتی لوگوں میں اس قسم کے اشتعال انگیز پروپیگنڈہ کے نتائج کسی وقت بھی سخت خطرناک نکل سکتے ہیں اور اس کا سدباب اسی طرح سے ہو سکتا ہے جب پاکستان کے حکمرانوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ اگر ہند کے کسی علاقہ پر حملہ ہوا تو ہندوستانی عوام جن میں کہ ہندوستانی مسلمان ہراول دستہ کے طور پر کام کریں گے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ پاکستان کے حکمرانوں کو یہ احساس دلانے میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈروں کو اہم پارٹ ادا کرنا ہے۔ یہ قومی فریضہ ہے اور ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں میں کام کرنے والے مسلمان لیڈروں کو یہ فریضہ ادا کرنے میں فخر کے ساتھ پیش پیش رہنا ہے۔

میری رائے میں اب مناسب وقت آگیا ہے کہ ہم میں سے چند ایک کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈروں کا ایک کنونشن بلانے میں پہل کرنی چاہیئے۔ جس میں پاکستان کی ہر جارحانہ کارروائی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لئے عوام کو تیار کرنے کے متعلق ایک موثر پروگرام وضع کیا جانا چاہیئے۔ اس بات کو بھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیئے کہ ریاست کشمیر جو کہ ہندوستان کا ایک جزو لاینفک ہے کے ایک حصہ پر آج بھی پاکستان کا قبضہ ہے۔ کشمیر کے اس حصے کے لوگوں پر گذشتہ دس سال سے پاکستانی حکمراں انسانیت سوز مظالم توڑ رہے ہیں اور یہ سارے لوگ مسلمان ہیں جوں جوں وقت گزرتا ہے ان پر پاکستانی حکمرانوں کے مظالم بڑھتے جاتے ہیں۔

دہشت پسندوں کا راج

مثال کے طور پر پونچھ میں گذشتہ چار ماہ سے دہشت انگیزی کا دور دورہ ہے۔ اس علاقہ میں مکانات جلائے گئے۔ مارشل لاء نافذ کیا گیا اور پنجاب کانسٹیبلری سپاہی اس علاقہ میں اسی طرح حکومت کرتے ہیں جس طرح ایک وقت مقبوضہ علاقوں پر نازی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آزاد کشمیر گورنمنٹ کے ایک وزیر نے بھی اس بدقسمت علاقہ کا دورہ کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ باغ اور راولپنڈی میں بہت سے محب وطن کشمیری مسلمان نظربند کیمپوں میں سڑ رہے ہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوا کہ طوٹا اور حویلی میں آزاد کشمیر پولیس فورس کے سپاہیوں نے کافی لوٹ مار کی۔ واضح رہے کہ یہ پولیس فورس مغربی پنجاب کے غنڈوں پر مشتمل ہے۔ سعید حسین۔ ابو کا خان عبدالعزیز بالونی اور کیپٹن فیروز خاں جیسے اہم سیاسی کارکنوں کو مارا پیٹا گیا۔ کیونکہ انھوں نے اس نظربندی کیمپ کے قیدیوں کی شکایات پیش کرنے کی جرأت کی تھی جس میں کہ وہ خود بھی مقید ہیں۔ ان میں سے ایک شکایت یہ تھی کہ انھیں روزانہ اٹھارہ سو گیلن پانی کی ضرورت ہے اور اس کے بجائے انھیں صرف آٹھ سو گیلن پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ پونچھ کے ان علاقوں میں کثیر تعداد عورتوں کو بھی مذکورہ صدر پولیس فورس کے سپاہیوں نے گرفتار کر لیا اور ان کی عصمت دری کی۔

نام نہاد آزاد کشمیر میں پاکستانی حکمرانوں کی بربریت کی ایسی ہی لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور جب تک کشمیر کا یہ حصہ پاکستان کے

قبضہ میں ہے یہ بربریت جاری رہے گی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو یہ باتیں پوری طرح زیر نظر رکھنی چاہئیں۔ نام نہاد آزاد کشمیر کے عوام تمام سیاسی اور شہری حقوق سے محروم ہیں اور وہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ پاکستانی حکمراں یہ چاہتے ہیں کہ انھیں حکومت برطانیہ نے جو علاقہ دیا ہے اس میں کشمیر کو بھی شامل کر لیا جائے۔

میں نے یہ واقعات محض اس وجہ سے بیان کئے ہیں کہ اس ملک کے عوام کے احساسات بیدار ہو سکیں اور ہم ایک ایسے ملک کے باشندوں کی حیثیت سے، جو کہ حقیقی معنوں میں آزاد ہیں، اپنے ان بھائیوں کے لئے بھی کچھ کرنے پر آمادہ ہوں جو کہ نام نہاد آزاد کشمیر میں خطرناک مصائب کا سامنا کر رہے ہیں اور ہم دنیا کو یہ بتا دیں کہ حکومت ہند ہر قیمت پر کشمیر کو بچانے کے لئے تیار ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ اس کی عزت کا سوال ہے بلکہ اس لئے کہ ہر ایک ہندوستانی مسلمان اس سلسلہ میں اپنا خون بہانے کے لئے تیار ہے۔

رائے عامہ

اس سلسلہ میں رائے عامہ کو منظم کرنا ایک مقدس کام ہے۔ اور یہی ہماری حب الوطنی کا تقاضہ بھی ہے۔ اس کام کی انجام دہی میں ہر ایک کو متحد رہنا چاہیئے۔ میں نے اپنی سیاسی زندگی میں عوام کے سامنے کبھی اتنی غیر معمولی اہمیت رکھنے والا مسئلہ نہیں دیکھا ہے۔ یہ مسئلہ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ پاکستان کو سلامتی کونسل میں مسلسل طور پر مایوسیوں کا سامنا ہوا ہے اور اب پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے عوام کو مشتعل کرنے اور شرارت پسندوں کو کرایہ پر لینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اس بارے میں ہم ہندوستانی جو کہ آزادی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ کشمیر کے پاکستانی مقبوضہ علاقوں کے لوگ بھی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوں، خاموش نہیں رہ سکتے۔ ہمیں اپنے ملک کی حفاظت اور اپنے مادر وطن کی آن اور شان کو برقرار رکھنے کے لئے صف آرا ہونا چاہیئے۔

برق طور

از: پرویز

استبداد ملوکیت کے مجسمہ فرعون پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کے پیکر ہامان اور سرمایہ داری کی خون آشامیوں کی تمثیل۔ قارون کے متحدہ محاذ کے خلاف صاحب ضرب کلیم کی نبرد آزمائی اور بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی بصیرت افروز اور عبرت انگیز داستان۔

قیمت مجلد ـــــ چھ روپے

ـــــ ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

حقائق و عبر

۱۔ میکیاولی شریعت

مسئلہ ملکیت زمین، مودودی صاحب کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں صفحہ ۵۲ پر لکھا ہے۔

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زمین جائداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنیاد پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوق ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے۔

اور صفحہ ۷۳-۷۲ پر یہ درج ہے۔

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے عائد کردہ حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو..... اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔

آپ نے دیکھا کہ بات کس قدر صاف ہے۔ یعنی خدا اور رسول کا فیصلہ یہ ہے کہ ایک شخص جس قدر دولت چاہے اپنے پاس جمع کر سکتا ہے اور جس قدر زمین کا چاہے مالک ہو سکتا ہے ان چیزوں پر کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب پنجاب میں زرعی اصلاحات کا چرچا تھا اور بڑے بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو "شرعی تحفظات" بہم پہنچائے جانے مقصود تھے۔

اب جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ انتخابات میں حصہ لیا جائے گا اور یہ ظاہر ہے کہ انتخابات میں ووٹ عوام (مزدوروں اور کاشتکاروں) کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اب "خدا اور رسول کے فیصلے" اور قسم کے ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے پچھلے دنوں جماعت اسلامی نے ایک لیبر کانفرنس منعقد کی جس میں حسب ذیل ریزولیشن پاس کیا (اجلاس کی صدارت مودودی صاحب فرما رہے تھے)

> اللہ تعالےٰ نے اس دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی ہے اور اصل قدر و قیمت سرمایہ کی نہیں انسان کی ہے اس لئے ایک اسلامی مملکت میں ملک کی دولت اور کاروبار کو عام شہریوں کی ترقی اور خدمت کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔ رائج الوقت نظام نے اس دنیا کے تمام ذرائع معاش پر ایک محدود گروہ کا تسلط قائم کر دیا ہے اور سرمایہ کو انسان کا خدا بنا رکھا ہے۔ اس لئے ملک کی تمام دولت اور کاروبار اس مخصوص گروہ کی اجارہ داری بن چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال سراسر ظالمانہ ہے اور ہم اسے ایک ایسے نظام سے بدل دینا چاہتے ہیں جس میں ملک کی دولت اور کاروبار پر اجارہ داری ختم ہو جائے اور عوام کو رزق حاصل کرنے اور دولت کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔ اس نظریہ کو بروئے کار لانے کے لئے جماعت اسلامی موجودہ معاشی نظام میں حسب ذیل تبدیلیاں چاہتی ہے۔ (۱) بڑی بڑی ملکیتوں اور دولت کے ذخیروں کو اسلامی قانون کے مطابق عوام میں پھیلانے کا کام بلا تاخیر شروع کیا جائے ....
>
> (انجام کراچی۔ مورخہ ۲۸ ۷/۵۷)

آپ نے غور فرمایا کہ اُس وقت "اسلامی قانون" کیا تھا اور اب "اسلامی قانون" کیا ہے؟

میکیاولی بیچارا تو یونہی بدنام ہو گیا۔ جو مقدس روباہ بازیاں "خدا اور رسولؐ" کے نام پر شریعت کے نقاب میں کی جاتی ہیں ان کا مقابلہ میکیاولی سیاست کیا کر سکتی ہے؟

اس ریزولیشن کو پڑھ کر ہمارے قارئین میں سے ایک صاحب نے ہمیں لکھا ہے کہ طلوعِ اسلام کو مبارک ہو کہ جس جرم کی بنا پر اسے ملحد، بے دین اور کمیونزم کا حامی کہا جاتا تھا اب اس جرم کا ارتکاب خود صالحین کے طائفہ کی طرف سے بھی ہو رہا ہے۔

لیکن جن لوگوں کا مذہب ہی ذاتی مصلحت کوشی ہو ان میں اس قسم کی تبدیلی کیا وجہ مبارکباد ہو سکتی ہے؟

۲۔ **الحمد للہ** | آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ جب کسی مولوی صاحب سے کہا جائے کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی کا جواز کیا ہے تو وہ جھٹ سے

کہدیں گے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اختلاف امتی رحمۃ ۔ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ طلوع اسلام جب اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ جب قرآن اختلاف کو خدا کا عذاب قرار دیتا ہے تو اللہ کے رسولؐ اسے کس طرح رحمت قرار دے سکتے تھے۔ لہذا یہ حدیث صحیح نہیں ہو سکتی اس پر اسے منکر حدیث قرار دیدیا جاتا ہے۔

اب دیکھئے کہ اس حدیث کے متعلق خود ان حضرات کی طرف سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔ جماعت اہلحدیث کے ترجمان 'الاعتصام' کی ۱۶ اگست کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

> زمرۂ قادیانیت کے محققین میں یہ عجیب بات دیکھی کہ انھوں نے جب کسی مسئلہ پر اظہار خیال فرمایا اپنی جہالت اور نافہمی کا ریکارڈ قائم کردیا ہے۔ ۲۴ جولائی کے "الفضل" کا اداریہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں چودھری روشن دین صاحب تنویر نے دریائے تحقیق میں غوطہ لگاتے ہوئے فرمایا ہے کہ حدیث " اختلاف امتی رحمۃ" کے تحت اگر عام مسلمان مرزائیوں سے اختلاف رکھتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ یہ کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ باعث رحمت ہے۔ بس سارے صفحہ میں اسی قسم کی تحقیق دکاوش کے موتی بکھیرے گئے ہیں۔
>
> "الفضل" کے قادیانی ایڈیٹر کو معلوم ہونا چاہیئے کہ "اختلاف امتی رحمۃ" کا جملہ بالکل بے اصل اور غیر مستند ہے۔ اور قطعاً اس لائق نہیں کہ اس کو حدیث سمجھ کر دلیل و برہان کے طور پر استعمال کیا جائے۔

للہ الحمد کہ حضور نبی اکرمؐ کا دامنِ تقدیس اس غلطبات سے تو پاک ہوا۔ (وہ پاک تو تھا ہی۔ ان کے نام لیواؤں نے اس کا اعتراف کرلیا کہ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت بہتان ہے) آپ دیکھیں گے کہ جوں جوں قرآن کی تعلیم عام ہوتی جائے گی اس قسم کی کتنی حدیثیں وضعی ثابت ہوتی چلی جائیں گی۔ یاد رکھئے احادیث کے صحیح اور غلط ہونے کا بنیادی معیار یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف جائے وہ کبھی نبی اکرمؐ کی حدیث نہیں ہو سکتی۔

۳۔ عدو شرے برانگیزد

لاہور میں جو ایک نئی تحریک چلی ہے کہ نماز اردو میں، یا اردو۔ عربی مخلوط ادا کی جائے (اور جس کے خلاف طلوع اسلام صراحت سے لکھ چکا ہے) اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ہمارے ارباب شریعت کو بھی اس کا احساس ہوا کہ لوگوں کو نماز کے معنی سمجھانے ضروری ہیں۔ چنانچہ الاعتصام لاہور کی ۱۶ اگست کی اشاعت میں "علمائے کرام" کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ

> مساجد کے امام اور خطیب حضرات اس طرف توجہ فرمائیں۔ وہ نمازیوں کو اور مقتدیوں کو ایک کلاس اور حلقہ تصور کریں انھیں باقاعدہ اور پورے التزام کے ساتھ نماز شروع کرنے سے پہلے یا نماز ختم کرنے کے بعد نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کا ترجمہ سکھائیں اور ان کے مفہوم اور تشریح سے ان کو آگاہ کریں۔

ہمیں امید ہے کہ اس کے بعد ہمارے "علمائے کرام" نمازیوں کو یہ بھی سمجھائیں گے کہ قرآن کے جو الفاظ مطلب سمجھے بغیر پڑھے جائیں ان کا کچھ

فائدہ نہیں ہوتا اور جو نماز بلا سمجھے پڑھی جائے وہ نماز نہیں ہوتی۔ اس وقت ان حضرات کا فتوےٰ یہ ہے کہ مطلب سمجھے بغیر پڑھنے سے بھی نماز ہو جاتی ہے اور الفاظ کے مفہوم کا سمجھنا ضروری نہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی (۴/۴۳) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

> بعض لوگ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جو شخص نماز کی عربی عبارات کا مطلب نہیں سمجھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ لیکن علاوہ اس کے کہ یہ ایک بے جا تشدد ہے خود قرآن کے الفاظ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ (تفہیم القرآن۔ جلد ۱۔ صفحہ ۳۵۲)

یاد رکھیے۔ جب تک اس غلط عقیدہ کو دور نہیں کیا جاتا کہ قرآن کے الفاظ بلا سمجھے محض دہرا لینے (بلکہ بعض اوقات ان پر صرف انگلیاں پھیر لینے) سے بھی "ثواب" حاصل ہو جاتا ہے۔ اور نماز کے الفاظ سمجھے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے اس وقت تک عوام، قرآن یا نماز کے الفاظ کا مطلب سمجھنے کے لئے بہ ذوق و شوق کبھی آمادہ نہیں ہوں گے۔ بلکہ وہ دل سے اس کی ضرورت کے بھی قائل نہیں ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک ہم "ثواب" اور "صلوٰۃ" کا صحیح (قرآنی) مفہوم لوگوں کے سامنے نہیں لاتے۔ اس وقت تک ہماری کوئی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

۴۔ نفرت کے بیج

پاکستان کی سالمیت پر ضرب کاری لگانے کے لئے وہ دن سب سے زیادہ منحوس تھا جب یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ملازمتوں میں صوبجاتی تناسب رکھا جائے۔ ہم نے اسی زمانے میں لکھا تھا (اور بار بار بتکرار لکھا تھا) کہ اس فیصلے سے پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور علاقائی اور صوبائی تعصب اس قدر شدید اور گہرا ہو جائے گا کہ پھر وہ کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکے گا۔ بات بالکل واضح تھی۔ ہندوستان میں جب ہم نے ہندو اور مسلمانوں کی دو الگ الگ قوموں کا مطالبہ کیا تو اس مطالبہ کو عملی شکل دینے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا تھا کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کا جداگانہ تناسب قائم کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہندو اور مسلمان دو متمیز عناصر نظر آنے لگ گئے اور ان میں ایسی گہری اور وسیع خلیج حائل ہوتی چلی گئی جو بالآخر ملک کی تقسیم پر منتج ہوئی۔ ہندو نے اس فرقہ وارانہ تناسب کی سخت مخالفت کی تھی اسلئے نہیں کہ اس سے چند اسامیاں مسلمانوں کو مل جاتی تھیں بلکہ اسلئے کہ اسکی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اس ایک فیصلہ سے متحدہ قومیت کے نظریہ کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ جب صوبائی تناسب کا فیصلہ پاکستان میں ہوا تو ہم نے کہا تھا کہ جداگانہ تناسب کا جو نتیجہ ہندوستان میں نکلا تھا وہی نتیجہ یہاں برآمد ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہاں تو اس جداگانہ تناسب سے ہندو اور مسلمان دو الگ عناصر میں تقسیم ہو گئے اور یہاں اسی تناسب سے مختلف صوبوں کے مسلمان ملت واحدہ بن جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ اسامیوں کو قابلیت کی بنا پر پر کرنے کے بجائے صوبائی تناسب کے اعتبار سے تقسیم کرنے سے نظم و نسق کی (EFFICIENCY) پر اس قدر تباہ کن اثر پڑیگا جس کے متحمل ہم نہیں ہو سکیں گے۔ بنا بریں ہم نے اس فیصلہ کی سخت مخالفت کی لیکن اسکے باوجود ارباب اقتدار نے اسے نافذ العمل رکھا۔ اور آج اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے ارباب بست و کشاد دن رات چلاتے رہتے ہیں کہ ملک میں صوبائی تعصب شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

سلسلہ اصلاح وتذکیر (محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

(۱۲)

[اس مضمون کی گذشتہ گیارہ اقساط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ، والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ بھائی بہنوں کو آپس میں اور میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ نیز قرابت داروں کو ایک دوسرے کے ساتھ باہم کس طرح پیش آنا چاہیئے اور ان کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ آئندہ اقساط میں یہ بتایا جائے گا کہ عام مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ اور ان کے ایک دوسرے پر کیا حقوق و واجبات ہیں؟ طلوع اسلام]

مسلمانوں کے باہمی تعلقات

گذشتہ اقساط میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآنی معاشرہ میں مسلمانوں کے باہمی رشتوں کا کیا وزن ہوتا ہے اور ایک رشتہ دار کو دوسرے رشتہ دار کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اب ہم ان رشتہ داریوں اور قرابتوں سے قطع نظر کر کے عام مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر گفتگو کریں گے۔

قرآن کریم نے انسانیت کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ایک ان لوگوں کا گروہ جو قوانین خداوندی کو تسلیم کرتے اور ان کے آگے اپنا سر جھکا دیتے ہیں ان کو قرآن مومن اور مسلم کہتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو قوانین خداوندی کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ ان سے انکار کی راہ اختیار کرتا ہے اس قسم کے لوگوں کو وہ کافر (نہ ماننے والوں) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے جو لوگ قوانین خداوندی کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کے آگے اپنا سر جھکا دیتے یعنی اپنی زندگی کو ان ہدایات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو قرآن اِخْوَانٌ اور اِخْوَۃٌ (یعنی بھائی بھائی) کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اِخْوَانٌ اور اِخْوَۃٌ، اَخٌ کی جمع ہیں۔ اَخٌ کے متعلق ہم اس مضمون کی پانچویں قسط میں لکھ چکے ہیں کہ

"عربی زبان میں بھائی کو اَخٌ اور بہن کو اُخْتٌ کہتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ اَخِیَّۃٌ اور اَخِیَۃٌ یا اَخِیَۃٌ اور اَخِیَّۃٌ سے

نکلے ہیں۔ عربی زبان میں اٰخِیَّۃٌ یا آخِیَّۃٌ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے دیوار میں چنے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کا درمیانی حصہ جانوروں کو باندھنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے یا اس رسی کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے زمین میں مٹی کے نیچے دبا دیئے جاتے ہیں اور اس کا درمیانی حصہ ایک حلقہ کی صورت میں زمین سے ابھرا ہوا ہوتا ہے۔ تاکہ اس حلقہ میں جانوروں کو باندھا جا سکے۔ آخٌ اور اُخْتٌ اسی اٰخِیَّۃٌ یا اِخِیَّۃٌ سے نکلے ہیں (محیط المحیط ص ج ۱) یہ ہے آخِیَّت (بھائی چارگی) کی بنیادی تصویر کہ لکڑی یا رسی کے دونوں کنارے اپنی اپنی انفرادیت (INDIVIDUALITY) رکھتے ہیں مگر وہ دیوار کے اندر چنے ہوئے اور زمین کے نیچے دبے ہوئے ہوتے ہیں مشاہدہ میں جو حصہ آتا ہے وہ ان کا درمیانی حصہ ہوتا ہے جو خود ایک وحدت ہوتا ہے۔ یعنی دو ہوتے ہوئے بھی ایک جگہ دوئی غیر مشہود (INVISIBLE) اور وحدت و یگانگت مشہود (VISIBLE) ہوتی ہے۔ بھائی بھائی اپنی اپنی شخصیت اور انفرادیت تو رکھتے ہیں مگر ان کی یہ انفرادیت اور شخصیت غیر مشہود سی ہونی چاہیئے۔ ان دونوں کو اس درجہ متحد العمل اور متحد الخیال ہونا چاہیئے کہ دونوں ایک ہی وحدت معلوم ہوں۔ ابن عرفہ نے کہا ہے کہ اُخُوَّتٌ کے معنی بھائی بھائی ہونے کے علاوہ ہم شکل اور عملی ہم آہنگی کے بھی ہوتے ہیں (تاج العروس ص ج ۱۰) قرآن کریم میں اِخْوَانٌ (اٰخٌ کی جمع) کا لفظ اَعْدَاءٌ کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے جس سے اس کے مفہوم کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ
فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۳)

اَعْدَاءٌ انھیں کہتے ہیں جن کے درمیان میں پچر (WEDGE) لگ رہی ہو۔ لہٰذا اَعْدَاءٌ کے مقابلہ میں اِخْوَانٌ وہ ہوں گے جن کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔ جن کے دل آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل چکے ہوں جیسے بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے سے مل جاتا ہے (فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ) بادل کے دو ٹکڑے اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں مگر جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں (اُلْفَتٌ بادلوں کے ٹکڑوں کے آپس میں اس طرح گھل مل جانے ہی کو کہتے ہیں) تو وہ غیریت کو کھو کر ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد اگر تم ان بادلوں کے ٹکڑوں کو الگ الگ کرکے دیکھنا چاہو تو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ ایک ایسی مکمل وحدت میں تبدیل ہو جاتے ہیں کہ جس سے ان کی غیریت قطعاً ختم ہو جاتی ہے (اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ) میں بَيْنَ قُلُوبِكُمْ کا لفظ ساتھ ہی یہ بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کا باہم اس طرح گھل مل جانا ظاہری اور جسمانی طور پر نہیں ہوتا۔ بلکہ قلبی طور پر ہونا چاہیئے۔

بعض علمائے نحو کا یہ بھی خیال ہے کہ بھائی کو آخٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا ارادہ اور آہنگ بعینہٖ دوسرے بھائی کا ارادہ اور آہنگ ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ لفظ وَخْیٌ سے نکلا ہے جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ آخٌ میں وَخْیٌ کا واؤ ہمزہ کے ساتھ بدل لیا گیا ہے۔ اس توجیہ کی بنا پر بھی بھائیوں کو آپس میں ہم مقصد اور ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ یعنی ایک کی مرضی دوسرے کی مرضی میں گم ہو جانی چاہیئے۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں آخٌ اور اُخْتٌ انھیں کہتے ہیں جو دل و دماغ، اور عمل و مقصد میں وہ اس طرح

گھلے ملے ہوتے ہیں کہ ایک ہی وحدت نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذرا اس نکتہ پر بھی غور کیجئے کہ اس اخیت کا وجود اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک اس رسی یا لکڑی کے وہ دونوں کنارے اپنی پوری توانائی، اس یگانگت و وحدت (حلقہ) کو باقی رکھنے پر صرف کرتے رہیں۔ جونہی ان میں سے کسی ایک پر خود نمائی کا شوق سوار ہوا اور وہ دیوار یا زمین سے باہر نکل آیا تو اس حلقہ کا وجود ختم ہو گیا۔ بعینہٖ یہی حال اس اخوت (بھائی چارگی) کا ہے جو قرآنی معاشرہ کا مقصود ہے کہ یہ بھائی بھائی اس وقت تک بھائی بھائی ہیں جب تک وہ ہم مقصد اور ہم آہنگ رہتے ہوئے اپنی پوری توانائیاں اس یگانگت کو باقی رکھنے کے لئے صرف کرتے رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کے دل میں بھی خود غرضی اور خود نمائی کا جذبہ ابھر آیا تو ان کی اخوت ختم ہو گئی۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اگر بھائی بھائی میں مرکزی وحدت نہیں ہے (ویسی ہی مرکزی وحدت جیسے رسی اور لکڑی کے دونوں کنارے اپنے وسط میں آکر مل جاتے اور ایک ہو جاتے ہیں) تو ان میں اخوت بھی نہیں ہے۔

قرآن کریم تمام مسلمانوں کو اِخْوَۃٌ کہتا ہے جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا معاشرہ کن مستحکم بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (۴۹/۱۰)

حقیقت یہی ہے کہ تمام مومن بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان اصلاحِ حال کی کوشش کرتے رہو۔ یعنی خدا کے قانون کے ساتھ ہم آہنگ بنے رہو۔ اس طرح توقع ہے کہ تمہاری مناسب نشوونما ہوتی چلی جائے گی۔

وہ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہنے اور باہمی الفت و محبت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ افتراق و اختلاف سے منع کرتا ہے۔ وحدتِ خیال اور وحدتِ عمل قرآن کریم کی بنیادی تعلیم ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا۔ وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا۔ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ۝ (۳/۱۰۳)

اور خدا کی رسی کو سب مل کر مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور باہمی اختلاف نہ کرو۔ اور اپنے اوپر خدا کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اسی نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیدا کر دی (اور اس طرح گھلا ملا دیا جس طرح بادل کے ٹکڑے ایک دوسرے میں گھل مل جایا کرتے ہیں اور تم (تباہی و بربادی کی) آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے اس نے تمہیں اس آگ کے گڑھے سے

بچا دیا۔ خدا اپنے قوانین کو یونہی واضح کرکے بیان کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ توقع ہے اس طرح تم راستہ پالو گے۔

مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے کسی قسم کا کوئی کھوٹ نہیں ہوتا۔ ہر مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمانوں کے لئے اچھی خواہشات اور نیک آرزوئیں ہی ہوتی ہیں۔ انھیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے اس طرح ہونا چاہئیے جیسا بھائیوں کے سامنے بھائی ہوا کرتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق مسلمانوں کے جنتی معاشرہ کا نقشہ ایسا ہونا چاہئیے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ. ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ. وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ۝ (۱۵/۴۵-۴۷)

بلاشبہ خدا کے قوانین کی نگہداشت کرنے والے سرسبز باغات اور رواں چشموں کے درمیان ہونگے ان سے کہا جائے گا کہ ان باغات میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ ہم نے ان کے سینوں سے کینہ و کپٹ کے تمام جذبات دور کر دیئے ہوں گے وہ باہمی بھائی چارگی کا نمونہ ہوں گے اور آمنے سامنے بلند پایہ تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔

قاتل بھی بھائی ہوتا ہے

ان کی یہ بھائی چارگی اتنی مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگی کہ اگر کسی مسلمان بھائی سے کوئی بڑی سے بڑی غلطی بھی سرزد ہو جائے حتیٰ کہ وہ غلطی سے (عمداً نہیں بلکہ غلطی سے) کسی مسلمان بھائی کی جان تک بھی لے لے تو اس کے باوجود یہ بھائی چارگی کا رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا۔ قاتل کو قانون خداوندی کے مطابق قصاص میں قتل کر دیا جانا چاہئیے لیکن اگر مقتول کے ورثاء میں سے کوئی وارث اپنے بھائی کی اس غلطی کو معاف کر دے (یہاں اپنے بھائی کے لفظ پر غور کیجئے) اور خون بہا لینا منظور کر لے تو ایسا کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں قاتل کو یہ خون بہا خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر دینا چاہئیے۔ اور مقتول کے ورثاء کو خون بہا کی وصولی میں جانے پہچانے طریقہ ہی سے اس کا پیچھا کرنا چاہئیے۔ قرآن کریم کی ان آیات کو غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۲/۱۷۸)

اے پیروان دعوت ایمانی! تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص مقرر کیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد۔ غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ لیکن اگر اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معافی مل جائے تو پھر خون بہا قبول کر لیا جائے گا اور (مقتول کے ورثاء کو) جانے پہچانے طریقہ پر قاتل کا پیچھا کرنا ہوگا۔ اور (قاتل کو) خوش اسلوبی کے ساتھ خون بہا ادا کر دینا ہوگا۔ یہ فیصلہ پروردگار کی طرف سے (قصاص کے حکم میں) تخفیف اور رحمت ہے لیکن

اگر کوئی اس کے بعد بھی حد سے تجاوز کرتا ہے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

جہاں تک دو مسلمانوں کے باہمی رشتۂ برادری کا تعلق ہے وہ اتنا مستحکم ہے کہ اس قدر سنگین جرم کے باوجود بھی وہ منقطع نہیں ہوجاتا۔ لیکن جہاں تک خود اس جرم کی سنگینی کا تعلق ہے وہ انتہائی شدید ہے۔ اتنا شدید کہ قرآن کریم کی میزان میں ایک متنفس کی جان کی حفاظت اتنا ہی وزن رکھتی ہے جتنا وزن کرۂ ارض کے تمام بسنے والے انسانوں کی جان کی حفاظت کا ہوتا ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ
اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (۵/۳۲)

اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل پر یہ مقرر کر دیا تھا کہ جو کوئی کسی آدمی کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو قتل کر دے" گویا اس نے پوری نوع انسانیت کو تہ تیغ کر ڈالا ہے۔

قرآن اس کا تصور نہیں کرتا کہ کوئی مسلمان (یعنی ایک بھائی) دوسرے مسلمان (یعنی دوسرے بھائی) کو جان بوجھ کر قتل کر دے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ
رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا .... (۴/۹۲)

ایک مومن کے لئے یہ کسی طرح بھی زیبا نہیں کہ وہ دانستہ طور پر کسی مسلمان کو قتل کر دے۔ البتہ بھول چوک ہی سے ایسا ہو سکتا ہے۔ اور بھول چوک سے جو آدمی کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو ایک مومن غلام یا باندی کو اس جرم کی پاداش میں آزاد کر دینا ہوگا اور ساتھ ہی مقتول کے ورثا کو اس کا خون بہا ادا کر دینا ہوگا۔ البتہ اگر مقتول کے ورثا خون بہا کی رقم بطور خیرات کے اسے چھوڑ دیں اور معاف کر دیں تو وہ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی مسلمان باوجود ایمان کے دعوے کے دانستہ طور پر اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان کی جان بوجھ کر جان لے بیٹھتا ہے تو یہ جرم خدا کی بارگاہ میں قطعاً قابل معافی نہیں ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○ (۴/۹۳)

اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس پر خدا کا غضب نازل ہوگا اور لعنت کی بوچھاڑ پڑے گی۔ اور خدا نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی میزان میں ایک مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دینا کس قدر سنگین جرم ہے۔ ساتھ ہی آپ نے یہ بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مسلمانوں کی باہمی بھائی چارگی کا رشتہ قرآن کریم کی میزان میں کس قدر مستحکم ہے کہ اگر اس قدر سنگین

اور شدید جرم غلطی سے سرزد ہو جائے تو اس کے باوجود وہ رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ قرآن کریم اتنے شدید جرم کے باوجود مقتول کے وارث کو قاتل کا بھائی قرار دیتا ہے۔

نومسلم تمہارے بھائی ہیں

حتیٰ کہ جو لوگ اب تک کفر اور شرک کی زندگی بسر کرتے آئے ہیں اور جن کی ساری زندگی تمہاری ایذا رسانی میں صرف ہوتی رہی ہے اگر وہ اپنی اس روش سے باز آجائیں اور توبہ کرلیں تو ان کے گذشتہ اعمال اس بھائی چارگی کے رشتہ میں قطعاً حائل نہیں ہوں گے۔ اب وہ ہر مسلمان کے اسی طرح بھائی بن جائیں گے جیسے پرانے مسلمان آپس میں بھائی بھائی تھے۔

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ ○ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۗ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○ (۹/۱۰-۱۱)

وہ لوگ کسی مومن کے بارے میں کسی عہد و میثاق کی حفاظت نہیں کرتے اور دراصل یہی لوگ ہیں جو حدود سے تجاوز کر جانے والے ہیں۔ پھر اگر یہ لوگ اپنی روش سے باز آجائیں اور توبہ کرلیں یعنی نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرنے لگیں اور سامانِ نشوونما دینے لگیں تو اس کے بعد وہ تمہارے بھائی بن جائیں گے۔ ہم اپنی آیات کو ان لوگوں کے لئے نکھار نکھار کر بیان کرتے ہیں جو علم کی دولت سے مالا مال ہیں۔

یتامیٰ بھی بھائی ہیں

اسی طرح وہ لوگ بھی تمہارے بھائی ہیں جو اپنے حالات کے پیشِ نظر معاشرہ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ معاشرہ میں ان کا اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنا تمہارے لئے باعثِ شرم ہونا چاہیئے جس کے بھائی اتنی بڑی تعداد میں موجود ہوں وہ خود کو تنہا محسوس کیوں کرے؟

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ (۲/۲۲۰)

اے پیغمبرِ اسلام! لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ ان کے حالات کی درستگی کا خیال بہرحال بہتر ہے۔ اگر تم اپنے اخراجات اور ان کے اخراجات (اس خیال سے کہ اس طرح ان کے اخراجات میں کفایت ہو جائے گی) ملا جلا لو تو اس میں کیا حرج ہے۔ بہرحال وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں خدا خوب جانتا ہے کہ کون ان کے حالات کو خراب کرنا چاہتا ہے اور کون درست کرنا چاہتا ہے۔ اگر خدا چاہتا تو تمہیں (یہ حکم دے کر کہ ہر حال میں ان کے اخراجات الگ ہی رکھو) دشواریوں میں ڈال سکتا تھا۔ (لیکن اس نے ایسا حکم نہیں دیا) بلاشبہ خدا بڑا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

۱۔ جتنی بھی تمہارے بھائی ہیں حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جن کے متعلق تم کچھ نہیں جانتے۔ حتیٰ کہ ان کے متعلق تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کن کے بیٹے ہیں اور کون ان کے باپ ہیں۔ ان کے والدین کے نام اگر تمہیں معلوم نہیں تو تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ تم انھیں اپنا بھائی اور اپنا بہی خواہ اور دوست کہکر پکارو۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ

فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ

بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۳۳/۵)

انھیں ان کے باپوں کی طرف نسبت کرکے پکارو۔ یہ طریق خدا کے نزدیک زیادہ مناسب ہے۔ لیکن اگر تمہیں ان کے باپوں کے نام معلوم نہ ہوں تو وہ بہر حال دین میں تمہارے بھائی اور دوست اور مددگار ہیں۔ غلطی سے اگر اس کے خلاف تمہاری زبان سے کچھ نکل گیا ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ اگر تمہارے دلوں نے جان بوجھ کر ایسے لوگوں کے بارے میں کچھ کہا ہے (تو اس پر ضرور مؤاخذہ ہوگا) اللہ سامانِ حفاظت بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔

(باقی)

حقائق وعبر (صنہ ۶۰ سے آگے)

منافرت بڑھتی جارہی ہے لیکن وہ کبھی نہیں سوچتے کہ اس تعصب اور منافرت کے جو اسباب ہیں انھیں رفع کیا جائے ان کا رفع کرنا تو ایک طرف وہ انھیں اور زیادہ قوی اور مستحکم کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کو باہمدگر مدغم کرکے ایک وحدت میں تبدیل کردیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ملازمتوں میں اس کے سابقہ صوبوں کا تناسب بدستور قائم ہے جس سے سندھی۔ بلوچی۔ پنجابی۔ بنگالی سرحدی کی تفریق وتمیز اسی طرح چلی آتی ہے۔ نیز پہلے یہ تناسب ملازمتوں تک ہی محدود تھا اب اس کا زہر تعلیم گاہوں تک بھی پہنچایا جارہا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ یہ تفریقات ہیں کہاں تک پہنچ کر دم لیں گی؟

حیرت ہے کہ ایک طرف ہمارے ذمہ دار حضرات پاکستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر ایک قوم بنانے کے لئے مضطرب و بیقرار ہیں اور دوسری طرف مختلف علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کو عملاً الگ الگ قوم بنائے چلے جارہے ہیں۔ یعنی وہ کوشش خلافِ اسلام اور یہ بھی خلافِ اسلام! اور دونوں کوششیں خلافِ پاکستان۔ یا للعجب۔

خطوکتابت میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔ (ناظم ادارہ)

اسلام کی سرگزشت

علمی حرکت کا اجمالی بیان

(مسلسل)

موالی اور علم

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے شہروں کے باشندے دو عنصروں پر مشتمل تھے۔ ایک عربی عنصر تھا اور دوسرا عجمی۔ صحابہ کے عہد میں حاملین علم زیادہ تر عربی تھے۔ کیونکہ اکثر صحابہ عربی تھے لیکن جب علمائے صحابہ نے مفتوحہ شہروں میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا تو ان سے علم حاصل کرنے کے لئے عربی اور عجمی دونوں عناصر ہی آگے بڑھے۔ حتیٰ کہ جب تابعین اور تبع تابعین کا عہد آیا تو بعض حاملین علم عربی تھے لیکن زیادہ تر موالی اور موالی کی اولادیں تھیں۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے ابن خلدون لکھتے ہیں کہ "اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ملت اسلامیہ میں ابتداءً علم و فن کی طرف رجحان نہیں تھا۔ یہ ان کی سادگی اور بدوی زندگی کا تقاضا بھی تھا۔ ان کے ہاں شرعی احکام تھے جو خدائے عزوجل کے اوامر اور نواہی پر مشتمل تھے لوگ انھیں اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے۔ کتاب اور سنت سے ان احکام کا ماخذ بھی وہ جانتے تھے کیونکہ انھوں نے یہ احکام خود صاحب شرع یا اس کے اصحاب سے اخذ کئے تھے۔ اس زمانہ میں قوم ان عربوں پر مشتمل تھی جو تعلیم تالیف اور تدوین وغیرہ سے واقف نہیں تھی نہ کبھی وہ ان چیزوں میں مصروف رہی تھی اور نہ ہی انھیں اس کی ضرورت پڑی تھی۔ صحابہ اور تابعین کے عہد میں معاملہ یونہی چلتا رہا۔ جو لوگ ان احکام کو محفوظ رکھنے اور دوسروں تک پہنچانے میں مخصوص سمجھے جاتے تھے انھیں یہ لوگ "قرا" کہتے تھے۔ یعنی ایسے لوگ جو کتاب پڑھ سکتے ہیں۔ اور اُمّی (ان پڑھ) نہیں ہیں۔ کیونکہ ان پڑھ ہونا (اُمّیت) صحابہ میں ان دنوں ایک عام صفت تھی ——— کیونکہ صحابہ زیادہ تر عربی تھے ——— یہی وجہ ہے کہ حاملین قرآن کو اُن دنوں قراء کہا جاتا تھا ...... اس کے بعد ان علوم نے آگے چل کر ایسے ملکات کی صورت اختیار کر لی جو تعلیم کے محتاج تھے اور اس طرح یہ علوم منجملہ دیگر صنائع کے شمار ہونے لگے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ صنائع در اصل تمدن کی پیداوار ہوا کرتی ہیں۔ مگر عرب کے لوگ تمدن سے بہت دور تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ یہ علوم متمدن بن گئے اور عرب ان سے دور رہ گئے۔ اس زمانہ میں تمدن عجمیوں میں یا ان جیسے لوگوں مثلاً موالی وغیرہ میں پایا جاتا تھا۔ مدنیت پر ان لوگوں کو زیادہ قدرت حاصل تھی کیونکہ ایرانی حکومت کے زمانہ سے حضارت اور تمدن ان کے گھروں کی لونڈی بنے چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ فن نحو کے امام سیبویہ ہوئے اور ان کے بعد فارسی ہوئے اور پھر ان کے بعد زجاج۔ نسبی اعتبار سے یہ تینوں کے تینوں عجمی ہیں۔ یہی کچھ حاملین حدیث، علماء اصول فقہ، حاملین علم کلام

اور اکثر مفسرین کا حال تھا۔ علم کی حفاظت اور اس کی تدوین کے لئے عجمی ہی آگے بڑھے۔ رہ گئے وہ عرب جنھیں اس تمدن اور تمدن کی گرم بازاری سے کچھ حصہ ملا بھی تو دولت عباسیہ میں انھیں ریاستی امور سے فرصت ہی نہیں مل سکی۔ انتہیٰ مختصراً

ابن خلدون عصر تدوین کے متعلق گفتگو فرما رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے ان کی مراد عباسی عہد ہے لیکن جو وجہ انھوں نے بیان کی ہے وہ اموی عہد پر بھی ـــ جو تابعین اور تبع تابعین کا عہد ہے ـــ حرف بحرف صادق ہے۔ البتہ ابن خلدون نے اپنے اس نظریہ میں کسی قدر غلو سے کام لیا ہے کہ عربوں سے ان کا وہ حصہ بھی چھین لیا جو علمی شرکت میں ان کو حاصل تھا۔ اموی عہد میں علما میں زیادہ مشہور عرب ہی تھے۔ مثلاً سعید بن المسیب۔ علقمہ۔ شریح۔ مسروق۔ نخعی وغیرہ لیکن اکثر علما موالی تھے یا موالی کے حکم میں تھے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں سلیمان بن یسار تھے۔ یہ بلند مرتبہ عالم اور فقیہ تھے۔ ان کے والد حضرت میمونہ نبی کریم صلعم کی زوجۂ محترمہ کے غلام تھے۔ ایسے ہی نافع عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے اور انھوں نے ہی ان کی زیادہ تر حدیثیں نقل کی ہیں۔ ان کی اصل قبیلۂ دیلم سے تھی ربیعۃ الرائے جو امام مالکؒ کے استاد ہیں اور ان کے باپ فروخ دونوں غلام تھے۔

مکہ مکرمہ کے علما میں مجاہد بن جبیر جو مخزوم کے غلام تھے اور ابن عباسؓ سے زیادہ تر تفسیری روایات نقل کرتے ہیں۔ ایسے ہی عکرمہ جو خود ابن عباسؓ کے غلام تھے اور جنھوں نے ان سے ان کا زیادہ تر علم نقل کیا ہے۔ اور عطا بن ابی رباح جو بنو فہر کے غلام اور جند میں پیدا ہوئے تھے[1] اور سیاہ فام تھے۔ ایسے ہی ابوالزبیر محمد بن مسلم بن تدرس جو حکیم بن حزام کے غلام تھے۔ یہ حضرات لوگوں کے لئے حدیثوں کو یاد رکھنے والے تھے۔

علمائے اہل کوفہ میں سے سعید بن جبیر زیادہ مشہور ہیں جو بنو والبہ کے غلام اور سیاہ فام تھے۔ بصرہ میں زیادہ مشہور حسن بن یسار ہیں جو زید بن ثابتؓ کے غلام تھے اور محمد بن سیرین جو کہ والد میسان کے قیدیوں میں تھے اور جن کی والدہ صفیہ ابوبکر صدیقؓ کی باندی تھیں ایسے ہی حسن بصری جن کے والد بھی میسان کے قیدیوں میں سے تھے۔

اہل شام میں مکحول ابن عبداللہ زیادہ مشہور ہیں جو اوزاعی کے استاد ہیں۔ ان کے والد بھی اہل ہرات میں سے تھے اور ان کی والدہ کابل کے بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کی بیٹی تھیں۔

مصر میں یزید بن حبیب مشہور تھے جو بنو ازد کے غلام اور اہل مصر کے مفتی تھے۔ لیث بن سعد نے انھی سے علم حاصل کیا تھا۔ یزید بربری الاصل تھے اور ان کے والد دنقلہ کے رہنے والے تھے[2]۔

ان کے علاوہ اور بہت سے علما ہیں جن کے ماں باپ عربی اور عجمی ہیں۔ جیسا کہ سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب۔ قاسم بن محمد بن ابوبکر۔ علی ابن الحسین بن علی بن ابی طالب معروف بہ زین العابدین۔ زمخشری نے بیان کیا ہے کہ ان سب کی مائیں یزدگرد کی بیٹیاں تھیں۔ اور مثلاً شعبی جو تابعین کے علامہ شمار ہوتے ہیں۔ ان کے والد بھی عربی ہیں۔ مگر ان کی والدہ جلولاء کی گرفتار شدہ

---

[1] جند یمن کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ [2] ان لوگوں کی نسبت اور جائے قیام کے متعلق ہم نے ابن خلکان اعلام الموقعین اور طبقات ابن سعد کی طرف رجوع کیا ہے

عورتوں میں سے ہیں۔

اگر ہم اس عصر کے علماء کو گنوانا شروع کریں کہ ان میں سے کون کون عربی تھے اور کون کون موالی میں سے تھے تو بات بڑی لمبی ہو جائیگی لیکن ان کے انساب پر ایک عمومی نظر ڈالنے ہی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی اکثریت موالی پر مشتمل ہے۔

عقد الفرید میں ہے کہ "ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ مجھ سے عیسیٰ بن موسیٰ نے پوچھا ——— یہ بڑا دیندار اور سخت متعصب تھا (یعنی اسے عربیت کا سخت تعصب تھا) ——— بصرہ کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ حسن ابن ابی الحسن۔ عیسیٰ نے پوچھا کہ پھر اس کے بعد کون ہے؟ میں نے کہا کہ محمد بن سیرین! پوچھا کہ یہ دونوں کون ہیں؟ میں نے کہا کہ دونوں موالی ہیں۔ پھر پوچھا کہ اچھا مکہ مکرمہ کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ عطاء بن ابی رباح، مجاہد سعید بن جبیر اور سلیمان بن یسار! کہنے لگا کہ یہ سب کون ہیں؟ میں نے کہا کہ سب غلام ہیں۔ کہنے لگا کہ اچھا مدینہ منورہ کے فقہاء کون ہیں؟ میں نے کہا کہ زید بن اسلم، محمد بن المنکدر اور نافع بن ابی نجیح! کہنے لگا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ بھی سب غلام ہیں۔ میرے اس کہنے پر عیسیٰ بن موسیٰ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پھر کہنے لگا کہ اچھا اہل قبا میں سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ ربیعۃ الرای اور ابن ابی الزناد! کہنے لگا کہ یہ دونوں کون ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ دونوں بھی غلام ہیں۔ تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر کہنے لگا کہ اچھا یمن کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ طاؤس اور اس کا بیٹا اور ابن منبہ۔ کہنے لگا کہ یہ تینوں کون ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ سب غلام ہیں۔ تو عیسیٰ کی گردن کی رگیں پھول گئیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر کہنے لگا کہ اچھا خراسان کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ عطاء بن عبداللہ خراسانی! کہنے لگا کہ یہ عطاء کون بزرگ ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ بھی ایک غلام ہیں۔ تو اس کے چہرہ کی سرخی اور تیز ہو گئی بلکہ سیاہ ہو گئی حتیٰ کہ مجھے اس کے چہرہ سے ڈر لگنے لگا۔ پھر کہنے لگا کہ اچھا شام کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ مکحول! بولا کہ یہ مکحول کون ہے؟ میں نے کہا کہ یہ بھی ایک غلام ہے۔ اس کے بعد تو اس کا سانس چڑھ گیا اور اوپر ہی اوپر آنے لگا۔ اس کے بعد بولا کہ اچھا کوفہ کا فقیہ کون ہے؟ بخدا اب اگر مجھے اپنی جان کا ڈر نہ ہوتا تو میں حکم بن عتبہ اور عمار بن ابی سلیمان کا نام لیتا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اب وہ بدی پر آمادہ تھا۔ تو میں نے کہا کہ ابراہیم نخعی اور شعبی! کہنے لگا کہ یہ دونوں کون تھے؟ میں نے کہا کہ دونوں عربی تھے تو عیسیٰ ابن موسیٰ نے بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

اسی کے قریب قریب وہ بیان ہے جو یاقوت کی معجم میں مادۂ خراسان میں ذکر ہوا ہے کہ عبدالرحمٰن ابن زید ابن اسلم کہتے ہیں کہ جب عبادلہ ——— عبداللہ ابن عباس، عبداللہ الزبیر اور عبداللہ ابن عمرو ابن العاص ——— کا انتقال ہو گیا تو فقہ تمام شہروں میں موالی کے قبضۂ اقتدار میں آ گئی۔ چنانچہ اہل مکہ کے فقیہ عطاء بن ابی رباح تھے اور اہل یمن کے فقیہ طاؤس تھے۔ اور اہل یمامہ کے فقیہ یحییٰ ابن کثیر تھے۔ اور اہل بصرہ کے فقیہ حسن بصری تھے۔ اور اہل کوفہ کے فقیہ نخعی تھے[1]۔ اور اہل شام کے فقیہ مکحول تھے اور اہل خراسان کے فقیہ عطاء خراسانی تھے رحمۃ

---

[1] اسی طرح بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نخعی بھی غلاموں میں سے تھے لیکن ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ قبیلۂ نخع سے تھے جو یمن کے مذحج قبیلہ کی ایک بڑی شاخ ہے ان کی والدہ بھی نخعی تھیں۔ ان کے نسب کے بارے میں اور بھی کئی قول ہیں۔ لیکن یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

مدینہ منورہ کے کہ خدا نے اس کو ایک قریشی فقیہ کے ساتھ ممتاز فرمایا تھا۔ چنانچہ اہل مدینہ کے فقیہ جن کے مقابلہ پر کوئی بھی نہیں آسکتا تھا سعید بن المسیب تھے۔

اسی قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جو تعصب کے جذبے سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن ان کی بنیاد بہرحال صحیح ہے۔ اور وہ بنیاد یہ ہے کہ علماء کی اکثریت غلاموں پر مشتمل تھی ـــــ ابن خلدون نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا سبب بھی تھا ـــــ وہ سبب یہ تھا کہ ـــــ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ـــــ صحابہ کی خدمت میں اکثر غلام رہتے تھے جو ان کے گھروں میں اور دوسرے کاموں میں ان کی خدمت کرتے تھے۔ اگر صحابی تاجر ہوتا تھا تو اس کے غلام تجارت میں اس کے مددگار ہوتے تھے۔ اگر صحابی عالم ہوتا تھا تو اس کے غلام اس کے شاگرد اور علم میں اس کے مددگار ہوتے تھے۔ چونکہ ان غلاموں میں عمدہ استعداد ہوتی تھی اس لئے وہ علم میں کافی ترقی کر جاتے تھے کیونکہ ہر وقت اپنے مالکوں کے ساتھ خلوت و جلوت میں اٹھنا بیٹھنا اور سفر و حضر میں ہر وقت ساتھ لگا رہنا انھیں میسر تھا ـــــ اس کی دلیل عبداللہ ابن عمرؓ کے غلام نافع ہیں۔ جنھوں نے ان سے ان کا زیادہ تر علم حاصل کیا تھا۔ چنانچہ محدثین شافعی عن مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کی سند کو سلسلۃ الذہب (سونے کی لڑی) شمار کرتے تھے۔ ایسے ہی ابن عباسؓ کے غلام عکرمہ تھے کہ عبداللہ ابن عباسؓ کا انتقال ہوا تو عکرمہ اس وقت بھی غلام تھے۔ چنانچہ ان کے بیٹے علی بن عبداللہ بن عباس نے ان کو خالد بن یزید بن معاویہ کے ہاتھ چار ہزار دینار میں فروخت کر دیا۔ عکرمہ اپنے آقا علی کے پاس آئے اور کہا کہ یہ کچھ آپ نے اچھا نہیں کیا کہ اپنے باپ کا سارا علم چار ہزار دینار میں فروخت کر دیا۔ جس پر علی کو ندامت ہوئی۔ انھوں نے خالد سے بیع کو فسخ کر دینے کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے بیع کو فسخ کر دیا اور اس کے بعد علی نے عکرمہ کو آزاد کر دیا۔ اس قسم کی مثالیں بے شمار ہیں۔

دینی حرکت پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو ہم اگلے باب میں کریں گے۔

دوسری حرکت

دوسری حرکت تاریخی حرکت ہے۔ اس حرکت سے ہماری مراد تاریخی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی حرکت نہیں بلکہ ہمارا مقصد گذشتہ بستیوں اور فنا شدہ اقوام کی خبروں، رسول اللہ صلعم اور آپ کے بعد خلفاء کے عہد میں پیش آنے والے حوادث و واقعات سے ہے، جو اسی عہد میں مملکت اسلامیہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس عہد کی روایات پر ایک پچھلتی ہوئی نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حرکت کافی وسیع تھی اور یہی وہ بنیاد تھی جس پر آگے چل کر کتابیں تصنیف کی گئیں۔ مثلاً ابن اسحاق اور ابن جریر وغیرہ کی کتابیں۔ مثال کے طور پر اگر ابن جریر طبری ہی میں تم تلاش و جستجو کرو اور اس کے سلسلۂ روایت کی چھان بین کرو تو تم دیکھو گے کہ وہ تیسویں یا چالیسویں راوی جو ابن جریر کی زندگی سے اتصال رکھتے ہیں عباسی دور کے ہیں اور یہ ان لوگوں سے روایت کر رہے ہیں جو ان سے پہلے اموی عہد یا خلفائے راشدین کے عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ تاریخی حوادث و واقعات جو مدون کئے گئے ہیں ہمارے اس عہد میں جس کی ہم تاریخ لکھ رہے ہیں کافی مشہور تھے۔ ابن اسحاق وغیرہ نے وہی باتیں بیان اور جمع کی ہیں جو ان کے زمانہ میں مشہور تھیں۔

یہ تاریخی حرکت ان تمام سرچشموں ہی سے سیراب ہوئی تھی۔

(اول) بعض خلفاء کو اس ضرورت کا احساس ہوا کہ ـــــ تدبیر مملکت ـــــ کے لئے دوسری قوموں کے بادشاہوں کے حالات وواقعات، ان کی سیاست اور ان کے انتظام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ مملکت اسلامیہ کی اس عظیم وسعت کے بعد جو اسے حاصل ہو چکی تھی ایسا ہونا قدرتی بات تھی۔ ان فتوحات سے پہلے جزیرۂ عرب میں مالیات کے نظم ونسق کا اندازہ نہایت ہی کمزور حالت میں تھا جو فتوحات کے بعد اس عظیم نظم ونسق کو چلانے کے لئے کسی طرح بھی کافی نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا یہ معلوم کرنا انتہائی ضروری ہو گیا کہ باقی دنیا میں اموال کن کن طریقوں سے حاصل کئے جاتے ہیں اور کن طریقوں سے انھیں محفوظ کیا جاتا ہے اور کن طریقوں پر انھیں خرچ کیا جاتا ہے۔ یہی حال شہروں کے انتظام، تنظیم اور طرز حکومت سے متعلق تھا۔ چنانچہ بعض خلفاء ان امور کے متعلق دوسری قوموں کے طرز عمل کو معلوم کرنے پر مجبور ہوئے۔ مثلاً مسعودی نے امیر معاویہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ "وہ اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ایک تہائی رات تک اخبار عرب، ایام عرب، عجم، شاہان عجم، ان کے رعایا سے متعلق انتظامات اور اقوام گذشتہ کے حالات کے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے بعد ان کے حرم میں سے ان کی بیوی وغیرہ کچھ لطیف اغذیہ مثلاً حلوہ وغیرہ حاضر خدمت کرتی تھیں جسے تناول کر کے وہ اندر چلے جاتے تھے اور ایک تہائی رات تک سوتے تھے اس کے بعد پھر اٹھ جاتے تھے اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر آکر بیٹھ جاتے تھے اور ان کے سامنے کتابیں لا کر رکھدی جاتی تھیں۔ جن میں بادشاہوں کی سیرتیں اور ان کے حالات، جنگوں اور جنگی تدابیر کا تذکرہ ہوتا تھا۔ کچھ غلام اس مقصد کے لئے مقرر تھے جو ان کتابوں کو پڑھ پڑھ کر سناتے تھے۔ ان کتابوں کی حفاظت اور ان کو پڑھ کر سنانے کا کام ان غلاموں کے سپرد ہوتا تھا۔ اس طرح امیر معاویہ کے کانوں میں ہر رات بہت سے واقعات، حالات، سیرت کی معلومات، آثار اور تدبیر وسیاست کی انواع واقسام پڑتی رہتی تھیں۔" اس طرح بہت سی تاریخی معلومات مسلمانوں کے خواص کے طبقہ میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی چلی گئیں۔

(دوم) یہ پہلی بات سے اہم ہے کہ بہت سے مختلف قبائل تاریخ کی اہمیت رکھتے تھے اسلام میں داخل ہوئے اور انھوں نے اپنی اقوام کی تاریخیں مسلمانوں میں پھیلانا اور سمونا شروع کر دیں۔ اس کی وجہ یا تو اپنی قوم کے ساتھ ان کی عصبیت تھی یا ایسا ہی کوئی دوسرا جذبہ تھا۔ یہودیوں میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے جنھیں یہودیوں کی تاریخ اور حوادث وواقعات کا علم تھا۔ اس علم کی بنیاد تورات اور اس کی شروح پر تھی۔ وہ لوگ ان واقعات کو مسلمانوں سے بیان کرتے تھے۔ اور مسلمانوں نے ان واقعات کا ربط قرآن کی تفسیر کے ساتھ لگا لیا۔ بلکہ بعض اوقات دوسری اقوام کے تاریخی واقعات سے بھی تفسیروں میں استفادہ کیا گیا۔ اگر تمہارا جی چاہے تو ایک طبری کی تاریخ ہی کی پہلی جلد ملاحظہ کر لیجئے۔ اس میں آپ کو ایسی بے شمار چیزیں مل جائیں گی۔

نوادرات

از:- علامہ اسلم جیراجپوری

علامہ موصوف کے مضامین کا مجموعہ ۔ بڑا سائز ۔۔ ۴۰ صفحات ۔ قیمت چار روپے۔

اب زیادہ محنت کی ضرورت نہیں

گنے کی نئی فصل تیار ہونا بڑی خوشی کا موقعہ سمجھا جاتا ہے گنے کا تازہ رس لوگ خود بھی پیتے ہیں اور اپنے بیوی بچوں اور دوست احباب کو بھی پلاتے ہیں تھوڑے رس کے لئے تو گنا پیلنے کی چھوٹی موٹی مشین بھی کام دے جاتی ہے لیکن اگر زیادہ مقدار میں گنا پیلنا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ مشین بہترین ہو اور ایسی صورت میں بیکو کی گنا پیلنے کی مشین سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوگی

چند خصوصیات

- یہ ایک گھنٹہ میں پانچ سے سات من گنا پیلتی ہے یعنی دوسری مشینوں سے کوئی ۲۰ فیصدی زیادہ۔
- اسے چلانا بہت آسان ہے کسی خاص مہارت کی ضرورت نہیں۔
- اسکے فاضل پرزے بڑی آسانی سے مل سکتے ہیں۔
- اسکی شکل وصورت بہت پسندیدہ ہے۔

BECO

بیکو پاکستان کی خوشحالی کا نشان ہے

بٹالہ انجینیرنگ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ

دی مال لاہور

شاخیں:- ڈنول روڈ کراچی ۲ نیو کلاتھ مارکیٹ حیدرآباد۔ ریلوے روڈ ملتان۔
جیٹی روڈ- چاٹگام- پاکستان ایونیو ڈھاکہ
یورپین ڈویژن آفس ۲۰ وکٹوریہ اسٹریٹ لندن ایس۔ ڈبلیو ۱

manhattan

رابطۂ باہمی

مرکزی بزم طلوع اسلام۔ کراچی

نے مستقل طور پر ایک طبی مرکز شیر شاہ کالونی واقع لیاری کوارٹرز میں کھول دیا ہے اس طبی مرکز میں ہر فرد کو طبی مشورہ اور دوا مفت مل سکتی ہے۔ مطب کے اوقات ۸ تا ۱۰ بجے اور ۶ تا ۸ بجے شام ہیں۔

مرکزی بزم طلوع اسلام کے دفتر واقع ۱۲۵ خلیق منزل خلیق موریٰ روڈ۔ گارڈن ویسٹ میں بالغوں کے لئے ابتدائی شبینہ اسکول کھولا گیا ہے۔ اوقات ۷ سے ۹ بجے شب ہوں گے۔

(۲) جن بزموں نے اپنی سالانہ رپورٹ اور قرار دادیں ابھی تک نہیں بھیجیں وہ براہِ کرم جلد از جلد ارسال فرما دیں۔

(۳) تمام بزموں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ماہانہ رپورٹ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک التزاماً بھیجدیں۔

بزم خواتین راولپنڈی

راولپنڈی میں خواتین کی بزم کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ عزیزہ بہن عسکریہ اس کی ترجمان منتخب ہوئی ہیں۔ بزم کے ہفتہ وار اجلاس "ملکوٹہ" میں منعقد ہوتے ہیں۔

(۳) بزم راولپنڈی کی طرف سے ظفر الحق روڈ پر بھی دار المطالعہ اور لائبریری کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

بزم ڈیرہ غازی خاں

کے ترجمان لکھتے ہیں کہ بزم کے اجلاس مہینہ میں دو بار ہوتے ہیں۔ اراکین بزم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ دار المطالعہ قائم کیا گیا ہے جس میں ادارہ طلوع اسلام کی پوری کتابیں موجود ہیں۔ یکم اگست کے اجلاس میں مندرجہ ذیل قرار داد منظور کی گئی۔ "بزم طلوع اسلام ڈیرہ غازی خاں کا یہ اجلاس مفکر اسلام علامہ پرویز صاحب سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی اولین فرصت میں لغت قرآن اور مفہوم قرآن کی اشاعت کے لئے انتظامات کریں نیز تمام بزم ہائے طلوع اسلام اس سلسلہ میں کوشش کریں"۔

بزم سید حسین

۵ اگست کو موضع سید حسین تحصیل و ضلع جہلم میں ایک اجلاس ہوا جس میں بزم طلوع اسلام قائم کی گئی تمام ضلع جہلم کے قرآنی احباب سے درخواست ہے کہ وہ اپنا رابطہ مندرجہ ذیل پتہ قائم کریں۔

مسعود احمد خاں صاحب۔ ترجمان بزم طلوع اسلام۔ موضع سید حسین۔ براستہ دینا تحصیل و ضلع جہلم

بزم چک نمبر ۱۰ شمالی

چک نمبر ۱۰ شمالی۔ ڈاک خانہ خاص تحصیل بھلوال۔ ضلع سرگودھا میں بزم کا قیام عمل میں لایا گیا ہے اور چوہدری نصر اللہ خاں صاحب کو ترجمان منتخب کیا گیا ہے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا کام عمدگی سے شروع کر دیا گیا ہے۔ علاقہ کی دیگر بزموں سے درخواست ہے کہ وہ اس نئی بزم سے اپنا رابطہ قائم کریں۔

سکریٹری بزم طلوع اسلام (مرکزی)
۱۲۵۔ گارڈن ویسٹ۔ خلیق منزل۔ کراچی

اب غیر ملکی عام اشیائے اسٹیشنری کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے

کیونکہ ہم نے مال کے بنانے میں اسی خوشنمائی، پائیداری اور معیار کو ملحوظ رکھا ہے جو انگلینڈ، جرمنی اور امریکہ وغیرہ اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ قومی ترقی کا انحصار ملک کی مصنوعات کو استعمال کرنے پر ہے۔

جنرل منیجر:۔ جنرل اسٹیشنرز لمیٹڈ (مینوفیکچررز)

بابُ المراسلات

منکرین حدیث کی فہرست

صاحب گنج۔ چھپرہ۔ (بھارت) سے ایک صاحب کی طرف سے حسب ذیل مکتوب موصول ہوا ہے۔

طلوع اسلام کے پرچے مل گئے۔ شکریہ۔ جولائی نمبر میں صفحہ ۶۵ پر کتاب "جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث" کا تعارف خوب ہے۔ اس کتاب سے منکرین حدیث کی جو فہرست نقل ہوئی ہے، اندازہ ہے کہ اُس میں کچھ نام نقل کرنے سے رہ گئے ہیں یا پھر مصنف ہی سے درج کرنا چھوٹ گیا ہوگا۔ مثلاً:۔

	نام منکرین حدیث	کتنی حدیثوں کا انکار کیا	کب
(۱)	امام بخاری۔ (جنھوں نے چھ لاکھ احادیث میں سے صرف ۷۲۷۵ کو درج کتاب کیا)	۵,۹,۲,۷۰۰	وفات سنہ ۲۵۶ھ / ۸۷۰ء
(۲)	امام مسلم (جنھوں نے تین لاکھ احادیث میں سے صرف ۴۳۴۸ کو درج کتاب کیا)	۲,۹۵,۹۵۲	وفات سنہ ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء
(۳)	ابن ماجہ۔ (جنھوں نے چار لاکھ احادیث میں سے صرف چار ہزار کو درج کتاب کیا)	۳,۹۶,۰۰۰	وفات سنہ ۲۷۳ھ / ۸۸۶ء
(۴)	ابوداؤد۔ (جنھوں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے صرف ۴۸۰۰ کو درج کتاب کیا)	۴,۹,۵۲۰۰	وفات سنہ ۲۷۵ھ / ۸۸۸ء
(۵)	ترمذی۔ (جنھوں نے تین لاکھ احادیث میں سے صرف ۳۱۱۵ کو درج کتاب کیا)	۲,۹۶,۸۸۵	وفات سنہ ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء
(۶)	نسائی (جنھوں نے دو لاکھ احادیث میں سے صرف ۴۳۲۱ کو درج کتاب کیا)	۱,۹۵,۶۷۹	وفات سنہ ۳۰۳ھ / ۹۱۵ء

امام بخاری کو بقول لوگوں کے بارہ لاکھ احادیث ملی تھیں، ورنہ چھ لاکھ کا تو خود اُن کو اقرار ہے۔ اس چھ لاکھ احادیث میں سے امام

بخاری نے صرف سات ہزار کئی سو کو لیا اور پانچ لاکھ بانوے ہزار سات سو احادیث کا سرے سے انکار کر دیا بلکہ انھیں ضائع کر دیا۔ دنیائے اسلام میں امام بخاری سے بڑا منکرِ حدیث تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ حالانکہ انھیں خادمِ حدیث بتایا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر آج کوئی شخص ان سات ہزار کئی سو احادیث میں سے کسی کا انکار کرتا ہے تو یہ راہ دکھائی ہوئی امام بخاری ہی کی ہے۔ آج احادیث کی جتنی کتابیں موجود ہیں۔ ان میں احادیث کی مجموعی تعداد ایک لاکھ بھی نہیں۔ اگر کوئی شخص ان سب کا بھی انکار کر دے تو بھی وہ امام نسائی کی بھی گرد کو نہیں پہنچ سکتا چہ جائیکہ امام بخاری جنھوں نے پانچ لاکھ بانوے ہزار سات سو احادیث کا انکار کر کے منکرینِ حدیث کی فہرست میں سرِ فہرست اپنا نام چھوڑا ہے۔

طلوعِ اسلام

اس ضمن میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ ان ائمہ جامعین حدیث نے یہ دعوےٰ نہیں کیا تھا کہ انھوں نے براہِ راست رسول اللہؐ سے (بذریعہ الہام) دریافت کر لیا تھا کہ کون کون سی حدیثیں قبول کر لی جائیں اور کونسی رد کر دی جائیں گی۔ انھوں نے یہ کچھ اپنے قیاس سے کیا تھا تو کیا یہ چیز تعجب انگیز نہیں کہ جو لوگ اپنے قیاس سے لاکھوں حدیثوں سے انکار کر دیں وہ تو خادمانِ حدیث قرار پائیں اور جو شخص ان میں سے کسی ایک حدیث کو بھی صحیح ماننے سے انکار کر دے اسے منکرِ حدیث ٹھہرا دیا جائے۔

---x---

۲۔ ایک معذرت

ایک صاحب نے (جنھوں نے اپنا پتہ نہیں دیا) لکھا ہے کہ طلوعِ اسلام کی ایک اشاعت میں فرقہ اہلِ قرآن کو چکڑالوی لکھا گیا ہے جو انھیں ناگوار گذرتا ہے۔ ہم نے یہ اصطلاح محض اس لئے استعمال کی تھی کہ یہ فرقہ اسی نام سے مشہور ہے۔ ورنہ اس سے ان کی تحقیر مقصود نہ تھی۔ بہرحال یہ چیز اگر ان کے لئے وجہ ناگواری ہوئی ہے تو ہم ان سے معذرت خواہ ہیں۔

---x---

مقامِ حدیث

(دو جلدوں میں)

حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جوابات۔ حدیث کی تاریخ۔ منکرینِ حدیث کون ہیں؛ غرضیکہ احادیث کے متعلق اتنی وسیع معلومات آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔

قیمت فی جلد چار روپے۔ مکمل آٹھ روپے

چند بصیرت افروز کتابیں

جشن نامے ہم ہر سال جشن جمہوریہ منانے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ مگر کیا ہر جشن اسی طرح منایا جائے گا جیسے ہم ہر سال مناتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی تبسم فشاں دردانگیز تصویر۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

مزاج شناسِ رسول پیشوایانہ ذہنیت کی راہیں کس طرح ہموار کی جارہی ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کو پڑھئے تاکہ جماعت اسلامی کا صحیح موقف آپ کے سامنے آجائے۔ قیمت۔ چار روپے

مقامِ حدیث (ہر دو جلد مکمل) حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جوابات۔ حدیث کی تاریخ۔ منکرین حدیث کون ہیں؟ غرضیکہ احادیث کے متعلق اتنی وسیع معلومات آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔ ہر جلد تقریباً ۴۰۰ صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے۔ مکمل آٹھ روپے۔

قرآنی فیصلے روزمرہ زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں؟ دین کے متعلق پُر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے۔ ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور جماعت اسلامی کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات قیمت دو روپے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے اسکے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات کا مجموعہ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

نوادرات (از علامہ اسلم جیراجپوری) علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ بڑا سائز ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت (از پرویز) (تیسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآن کے ارشادات۔ بالخصوص عورتوں اور بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اسلام کی بنیادی تعلیم کیلئے اس سے بہتر کتاب آپکو نہیں ملیگی۔ قیمت دو روپے

اقبال اور قرآن (از پرویز) علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۱۵۹/۳ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

پیشگی خریداران

یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا تھا۔ گذشتہ چار سال میں اکثر و بیشتر زرِ پیشگی کے عوض مطبوعاتِ ادارہ دی جا چکی ہیں۔ اور متعلقہ کھاتوں میں یا تو کچھ باقی ہی نہیں رہا ہے یا آمد سے خرچ زائد ہو چکا ہے۔ زائد خرچ کی ادائیگی کے لئے فرداً فرداً یاددہانی کرائی جا چکی ہے۔

زرِ پیشگی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں قابلِ قدر مدد ملی ہے۔ اس لئے اس سلسلہ کا جاری رکھنا بہمہ وجوہ مستحسن ہے۔ توقع ہے کہ جن اصحاب کا زرِ پیشگی ختم ہو چکا ہے وہ مزید ایک سو روپے یکمشت یا باقساط ارسال فرما کر اس مفید کام میں ضرور حصہ لیتے رہیں گے۔

قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب جو تا حال پیشگی خریدار نہیں بنے ہیں ان کی توجہ اس مفید سلسلہ کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے تاکہ وہ اس میں جلد از جلد شامل ہو جائیں۔

پیشگی خریدار بن کر آپ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں معتد بہ امداد کچھ خرچ کئے بغیر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس اسکیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک سو روپے کی رقم ادارہ کے پاس جمع کرا دیں۔ ادارہ اپنی مطبوعات (جنہیں آپ لینا پسند کریں) آپ کو گھر بیٹھے پہنچاتا رہیگا۔ اور محصولڈاک بھی اپنے پاس سے ادا کریگا۔ اس طرح آپ کو آپ کے جمع کردہ روپے کی کتابیں بلا محصولڈاک مل جائیں گی۔ اس میں ہمارا فائدہ صرف اتنا ہی ہے کہ ہمیں کچھ رقم پیشگی مل جاتی ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۳/۱۵۹۔ ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش

دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے

چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک

نایاب تحفہ ہے

جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور

جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے

چھوٹا مسواک ہر چھوٹی اور بڑی دوکان پر ملتا ہے